

آب گم

مشتاق احمد یوسفی

۱۹۹۹ء

• غنوریم، غنوریم

مشتاق احمد یوسفی

”احسان بھائی! منور حسین بھی رخصت ہو گئے۔ انتقال سے پہلے۔“

”کس کے انتقال سے پہلے؟“ میاں احسان الہی نے اپنی بے نور آنکھوں سے چھت کے
نکچے کو تکتے اور فالج زدہ ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے اٹھا کر دل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

انہیں وہ نہ کر این جاننا کے درد کا شبہ ہو رہا تھا۔

یہ جنوری ۱۹۸۷ء کا ذکر ہے، مجھے اپنا مدعا بیان کرنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔

میاں احسان الہی پانچ سال سے صاحب فراش تھے۔ فالج کے حملے کے بعد وہ امراض قلب

کے ہسپتال میں دس بارہ دن ”کوما“ میں رہے۔ جب ہوش آیا تو انہیں معلوم ہوا کہ

ان کا آدھا جسم مفلوج ہو چکا ہے۔ بینائی جاتی رہی۔ قوت گویائی بھی بری طرح متاثر

ہوئی۔ حافظہ آنکھ پھولی کھیلنے لگا۔ صرف تکلیف وہ باتیں یاد رہ گئیں۔

اگر اب انہیں کوئی پہلی بار دیکھتا تو یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی سوا چھ فٹ، دو

سو دس پونڈ اور پہلوانی ڈیل ڈول والا شخص ہے جو بہتر سال کی عمر میں صبح چار بجے

ڈیڑھ گھنٹے ڈنٹر بیٹھک لگاتا، پھر ایک گھنٹے ٹینس کھیلتا اور دن میں چار پانچ میل پیدل

چلتا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں دل کے پہلے شدید دورے کے بعد انہوں نے بد پرہیزی، بیٹھکوں اور

برم آرائیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ لندن گئے تو ابن حسن برنی کی طرح انہیں بھی کہیں

کوئی زینہ نظر آ جاتا تو اس پر چڑھتے ضرور تھے۔ کہتے تھے ”اس سے دل قوی اور بڑھاپا پسپا ہوتا تھا۔ ساٹھ پینسٹھ برس پہلے چنیوٹ کے نواح میں کوئی درخت ایسا نہیں تھا جس پر میں نہ چڑھا ہوں۔“ ڈاکٹروں نے غذا میں سخت پرہیز کی تاکید کی۔ انہوں نے چنیوٹ سے اصلی گھی اور آم کا اچار منگوانا تو چھوڑ دیا لیکن چنیوٹی کنا، سندھی بریانی، برنس روڈ کی ترترائی تافان، کوئٹہ کے بچی کباب، بادام کی حیدر آبادی لوزات، ملتان کے انور رنول۔ مختصر یہ کہ دل کے مریض کے لیے خودکشی کے نسخے کے جملہ اجزاء نہیں چھوڑے۔ خود ہی نہیں اپنے معالجوں کو بھی گھر بلا کر بڑے شوق اور اصرار سے کھاتے۔ کہتے تھے ’لذیذ غذا سے مرض کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ اور طاقت پیدا ہوتی ہے۔ وہ بدستور اپنے خلاف وضع طبی معمولات پر قائم رہے۔ روزے بھی نہیں چھوڑے کہ بچپن سے رکھتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح بیچ وقتہ نماز اب بھی باقاعدگی سے قضا کرتے تھے۔ تاویل یہ پیش کرتے کہ اب شروع کروں تو لوگ کہیں گے ’میاں صاحب ایک ہی بارٹ انیک میں اٹھک بیٹھک کرنے لگے۔ فیا بیٹس بھی ہو گئی۔ لیکن سونے سے پہلے ایک پاؤ فل کریم والی آئس کریم ضرور کھاتے۔ جتنے ذہین تھے اس سے زیادہ خود رائے۔ ہر مسئلہ پر ’خواہ طبی ہی کیوں نہ ہو‘ وہ الگ اپنی رائے رکھتے تھے۔ کہتے تھے آئس کریم قلب کو ٹھنڈک پہنچاتی اور بلڈ پریشر کو قابو میں رکھتی ہے، بشرطیکہ مقدار قلیل نہ ہو۔ سرگودھا یا ساہیوال اپنے سدھیانے جاتا ہوں تو ٹکلف میں رات کو آئس کریم کا ٹافہ ہو جاتا ہے۔ رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ جس رات آئس کریم نہ کھاؤں اس رات مجھ پر بہت کاٹتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں آپ کو معلوم ہے، یورپ کی سیاحت پر گیا تھا۔ کئی دن تک بریانی نہیں ملی۔ چنانچہ ویانا میں ہرنیا کا آپریشن کرانا پڑا۔ آپ میرے چٹور پن اور بد پرہیزی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ غالب کو دیکھئے۔ ساری عمر ناقدری اور عسرت و تنگ دستی کا رونا روتے رہے۔ خصوصاً آخری دنوں میں۔ لیکن ذرا مرض الموت میں ان کی آخری غذا تو ملاحظہ فرمائیے۔ صبح کو سات بادام کا شیرہ، قد کے شربت کے ساتھ۔

دوپہر کو سیر بھر گوشت کی بخنی۔ تین شاہی کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔ بھائی میرے! یہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے، سوائے ستم پیشہ ڈومنی کے۔ لیکن مجھے تو مرض الموت کے بغیر بھی اتنی کیلوریز میسر نہیں۔ اور ہاں، شراب کے ضمن میں بادہ پر نگالی کے بجائے خانہ ساز کی شرط توجہ طلب ہے۔ علاوہ ازیں صرف پانچ روپے بھر شراب غالباً اس لیے پیتے تھے کہ اگر اس کی مقدار بڑھا دیتے تو پھر اتنا ہی عرق شیر بھی زہر مار کرنا پڑتا۔ بھائی میرے! میں تو دودھ کی آئیں کریم صبر و شکر سے کھاتا ہوں۔ کبھی تولہ ماشہ کی قید نہیں لگائی۔“

ڈاکٹروں سے ایکس رے اور مرض کی تشخیص کرانے کے بعد اکثر بائیو کیمسٹری سے خود اپنا علاج کرتے۔ ایسی قوت ارادی کے مالک اور ایسے بقراط مریض پر ڈاکٹر کو بھی غصہ نہیں آتا، ترس اور پیار آتا ہے۔ حلقہ یاراں میں جب وہ خوش گفتاری پر آتے تو ڈمپل ان کے رخسار ہی میں نہیں فقروں میں بھی پڑتا تھا۔ بالآخر ان کی بدپرہیزی اور لاجواب کر دینے والی منطق کا نتیجہ شدید فالج کی شکل میں رونما ہوا۔

میں ڈرائنگ روم اور برآمدے سے ہوتا ہوا ان کے کمرے تک پہنچا تو دیکھا کہ ان کے میوزک روم میں (جس میں نو دس لاؤڈ سپیکر اس خوبی سے لگائے گئے تھے کہ ایک بھی نظر نہیں آتا تھا) تالا پڑا ہے۔ ان کی ذاتی لائبریری بھی، جس کی سینکڑوں کتابوں کی قیمتی جلدیں انہوں نے نظام دکن کے شاہی جلد ساز سے بطور خاص بنوائی تھیں، چار سال سے بند پڑی تھی۔ اسی لائبریری میں انہوں نے میرا تعارف نیاز فتح پوری، مولانا محمد ایوب دہلوی، محمد حسن عسکری اور سلیم احمد سے کرایا تھا۔ اور یہیں سے انہوں نے ایک دفعہ آدھ گھنٹے تک مجھے فون پر استاد بندو خاں کی سارنگی سنوائی تھی کہ وہ اپنے ہر شوق اور لطف میں دوستوں کو شریک کر کے اپنی خوشی دوایا کرنے کے رمز سے واقف تھے۔

فون پر سارنگی سنوانے کا قصہ یہ ہے کہ ان کے والد مرحوم حاجی محمد یعقوب صاحب اپنے گھر میں تاش، پرانی عورتوں کے فونو (مراد ایکٹریسٹوں سے تھی) اور پاندان رکھنے کے تو

خلاف تھے ہی، گانے کی محفل کے بھی روادار نہ تھے۔ ”بیٹا جی! موسیقی حرام تو ہے ہی، منحوس بھی ہوتی ہے۔ جس گھر میں ایک دفعہ طبلہ یا گھنگھرو بج گئے، اس گھر کے سامنے ایک نہ ایک دن دوالے اور قرقی کا ڈھول بجنا لازمی ہے۔ وہ گھر اجڑے ہی اجڑے۔ اسے میری وصیت جانو۔“ وصیت کے احترام میں میاں احسان الہی اس مترنم نحوست کا اہتمام عاجز کے گھر کرواتے تھے۔ لیکن الحمد للہ مرحوم کی پیش گوئی کے مطابق ہمارے گھر کے سامنے کبھی قرقی کا ڈھول نہیں بجا۔ کسی بھی گھر کے سامنے نہیں بجا جب کہ اس عرصے میں ہم نے (کرائے کے) نو گھر تبدیل کئے۔ میاں احسان الہی اپنے گھر میں موسیقی صرف تین صورتوں میں جائز و مباح سمجھتے تھے۔ اول، گانے والی زندہ حالت میں نہ ہو۔ مطلب یہ کہ اس کے گانے کا صرف ریکارڈ یا ٹیپ ہو۔ دوم، ان کے گھر میں گانے والا بالکل تنہا گائے۔ یعنی نہ طبلے کی شگت ہو اور نہ ان کے علاوہ کوئی اور سننے والا موجود ہو۔ نیز یہ اندیشہ نہ ہو کہ گانے کے بول سمجھ میں آ جائیں گے۔ یعنی راگنی پکی ہو۔ سوم، گانے والے کو داد کے سوا کچھ اور نہ دینا پڑے۔ مطلب یہ کہ گانے والا فی سبیل اللہ گلوکاری کرے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان پاکیزہ شرائط و قیود کے ساتھ جو شے ظہور میں آئے گی وہ والد مرحوم کی وصیت تو ہو سکتی ہے، موسیقی ہرگز نہیں۔

میاں احسان الہی اس وقت کمرے کے وسط میں ایک اونچے اسپتالی بیڈ پر نئی ریشمی دلائی اوڑھے نیم غنودگی کے عالم میں لیٹے تھے۔ دائیں دیوار پر عالم جوانی کی دو تصویریں لٹکی تھیں۔ ایک میں وہ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ کھڑے تھے، دوسری میں وہ بندوق کا بٹ (کنڈہ) مردہ نیل گائے کی تھو تھنی پر رکھے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ دونوں تصویروں کے نیچے ان کی نئی ان ویلڈ چیئر (معذروں کی کرسی رواں) رکھی تھی۔ ان کے سرہانے ایک اونچے اسٹول پر وہ قیمتی دوائیں بھی تھیں جن کے ناکارہ و بے اثر ہونے کا وہ نیم زندہ اشتہار تھے۔ اس وقت تو ان کے حافظہ کا قائل ہونا پڑا اس لیے کہ انہوں نے

میری تواضع کے لیے فریسکو سے میری پسندیدہ گرم جلیبیاں اور ناظم آباد کے ملا حلوائی کے گلاب جامن منگوائے تھے۔ دائیں طرف دیوار سے لگے ساگوان کے کنگ سلیز بیڈ پر نکلے نہیں تھے۔ ان کی بیگم کے انتقال کو دو مہینے ہوئے تھے۔ دروازے کے سامنے والی کھڑکی کے کارنس پر ایک چھوٹا سا کیٹ پلیئر اور ان مشاعروں کے ٹیپ رکھے تھے جو گزشتہ پینتیس برسوں میں اس لان پر ہوئے تھے جس کے لیے گھاس ڈھاکہ سے 'گلاب اور پام کے درخت پنڈی اور سری لنکا سے منگوائے تھے۔ فالج کے پیش نظر پنکھا 'ایئر کنڈیشنڈ' کھڑکیاں 'بری خبروں کی اطلاع' بچوں کا داخلہ' سب بند تھے۔ مجھے خیال گزرا کہ ان کی سماعت بھی متاثر ہو چلی ہے۔ میں نے ذرا اونچی آواز میں دہرایا۔

"ہمارے یار جانی منور حسین مر گئے۔"

"ہاں" مجھے کسی نے بتایا تھا۔ "انہوں نے بڑی لگنت سے کچھ کہا جس کا مطلب میں نے یہی سمجھا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے۔ میری بات پر وہ اپنی توجہ میں پچیس سیکنڈ سے زیادہ فوکس نہیں کر پا رہے تھے اور حاضر دماغی کے اس مختصر سے کوندے میں اپنا مدعا بیان کرنے میں مجھے خاصی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بات یہ تھی کہ اٹھائیس سال کراچی میں رہنے کے بعد میں نے جنوری ۱۹۷۹ء میں لندن جانے کے لیے رخت سفر باندھا تو پہلے اپنے دوستوں (جن کے نام رکھی خانہ پری کی خاطر میاں احسان الہی اور منور حسین فرض کر لیجئے) نام میں کیا رکھا ہے' دوست کو کسی بھی نام سے پکاریں' گلوں ہی کی خوشبو آئے گی) کی باتیں اور یادیں انہیں کی زبانی ٹیپ پر محفوظ کیں۔ مفصل نوٹ بھی لیے۔ ان یادداشتوں پر مبنی و مشتمل دس خاکے اور مضامین لندن میں بڑی تیز قلمی سے لکھ ڈالے اور حسب عادت پال میں لگا دیئے کہ ڈیڑھ دو سال بعد نکال کر دیکھیں گے کہ کچھ دم ہے بھی یا نرے سوختنی ہیں۔

میاں احسان الہی اور منور حسین سے دوبارہ ان کی اشاعت کی اجازت چاہی جو انہوں نے

بخوشی اور غیر مشروط طور پر دے دی۔ میں نے صاف کرنے کے لیے مسودہ نکال کر دیکھا تو ایک عجیب کیفیت سے دو چار ہوا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سب کچھ کسی اور نے لکھا ہے۔ یہ بھی بالکل عیاں تھا کہ یہ دو کتابوں کا مواد ہے۔ میں ایک مسودے سے دو کتابیں برآمد کرنے کا جتن کر رہا تھا کہ منور حسین کا ایک مختصر سا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ مجھے تو ذاتی طور پر کوئی تامل یا اعتراض نہیں، لیکن ممکن ہے اس کی اشاعت میرے اعزہ و اقربا کو اچھی نہ لگے۔ لہذا ان باتوں اور یادوں کو میرے نام سے منسوب نہ کیا جائے۔ قبل اس کے کہ میں کراچی جا کر ان سے اس موضوع پر مفصل گفتگو کروں، دو تین مہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

میری روداد سن کر میاں احسان الہی نے نوٹے پھوٹے لہجے میں کہا کہ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ پھر کہنے لگے، 'بت دن ہو گئے۔ اب پاکستان آ بھی جائیے۔ ہمارے بعد آئے تو کیا آئے۔ بینائی بالکل جاتی رہی۔ کبھی کبھی مجھے آپ کا چہرہ یاد نہیں آتا۔ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ 37 سال میں میں نے انہیں دوسری بار روتے دیکھا۔

اب میں عجیب پس و پیش میں مبتلا ہو گیا۔ دونوں کی یادیں اور باتیں ایک دوسرے میں کچھ اس طرح گتھی اور گندھی ہوئی تھیں کہ ان جڑواں سیاسی تحریروں کو بے ضرر عمل جراحی سے علیحدہ کرنا میرے بس کا کام نہ تھا۔ اور نہ یہ ممکن تھا کہ ایک کے نام، مقام اور شناختی کوائف کا تو انکشاف کر دوں اور دوسرے کی تبلیہیں لباس کر کے افسانوی لبادہ پہنا دوں۔ ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ سارے مسودے کو ایک قلم مسترد کر کے نہ صرف نام اور مقام بدل دوں، بلکہ اول تا آخر سب کچھ Fictionalise کر دوں، جس کا ان دونوں سے کوئی تعلق نہ ہوا۔ اور میں نے یہی کیا۔

چنانچہ "آبِ غم" کے پانچ کہانی خاکوں میں آپ جو کچھ ملاحظہ فرمائیں گے، اس کا ان دوستوں کے واقعات زندگی یا ان کے احباب، بزرگوں اور لواحقین سے قطعاً کوئی مماثلت

نہیں ہے۔ مودیانہ گزارش ہے کہ فکشن کو فکشن ہی سمجھ کر پڑھا جائے۔ اگر کوئی واقعہ سچ یا کردار ”اصلی“ نظر آئے تو اسے محض سوء اتفاق تصور فرمائیے۔ تمام تر واقعات و کردار فرضی ہیں۔ البتہ جن مشاہیر کا ذکر جمل کہیں ”بہ بدی“ یا بر بنائے تنقیص آیا ہے، اسے جھوٹ نہ سمجھا جائے۔ اتنا ضرور ہے کہ میں نے حتی الامکان منور حسین اور میاں احسان الہی کے مخصوص پیرایہ بیان اور انداز گفتگو کی لٹک اور کہیں کہیں آپس کی نوک جھونک کے دوران شرار جتہ و فقرہ برجستہ کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

یوں بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ فکشن ہے یا سچی واردات یا ان دونوں کا ملغوبہ جسے آج کل Faction (Fact+Fiction) کہا جاتا ہے۔ ایک چینی دانہ کا قول ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بلی سیاہ ہے یا سفید۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ چوہے پکڑ سکتی ہے یا نہیں۔

اس پس منظر کا ذکر و وضاحت مجھ پر اس لیے بھی واجب ہے کہ اس کتاب کا اصل محور، محرک اور باعث تصنیف ہر دو یارانِ رفتہ کی صحبت اور مطابقت تھے جو میری زندگی کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ وہ صحبت یاراں میں ہر لمحے کو ایک جشن سمجھ کر گزارتے تھے۔ اس قرض اور نعمتِ عظمیٰ کا اخفا بددیانتی ہو گی۔

جس اکھڑی اکھڑی گفتگو کا اوپر ذکر آیا ہے، اس کے کچھ ہی دن بعد میاں احسان الہی بھی اپنے رب سے جا ملے اور دیس سونا کر گئے۔ اور اب میں ایک بین الاقوامی مالیاتی ادارے کی زیرِ زر پرستی گیارہ سال لندن میں گزارنے کے بعد وطن کو مراجعت کی تیاری کر رہا ہوں۔ ان کا لگہ اور خدشہ صحیح ثابت ہوا۔

پچھلے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ذاتی، ادبی، پیشہ ورانہ، سیاسی اور قومی اعتبار سے اس عشرۂ رائیگاں میں نیاں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سب کچھ کھو کر بھی کچھ نہ پایا۔ البتہ ملکوں ملکوں گھومنے اور وطن سے دور رہنے کا ایک بین فائدہ یہ دیکھا کہ وطن اور اہل وطن سے محبت نہ صرف بڑھ جاتی ہے بلکہ بے طلب اور غیر مشروط بھی ہو جاتی ہے۔

سفر کردم بہر شہری دویدم
بہ لطف و حسن تو کس را ندیدم

Urdu4U.com

نقصان یہ کہ ہر خبر اور افواہ جو ادھر سے آتی ہے، دل دہلانے اور خون جلانے والی ہوتی ہے۔

پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ سچ نکلتی ہیں۔ یہ عمل دس گیارہ سال تک جاری رہے تو حساس آدمی کی کیفیت سیموگراف کی سی ہو جاتی ہے، جس کا کام ہی زلزلوں کے جھٹکے ریکارڈ کرنا اور ہمہ وقت لرزتے رہنا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری سیاست کا قوام ہی آتش فشاں لاوے سے اٹھا ہے۔

دن رات ہے اک زلزلہ تعمیر میں میری

لیڈر خود غرض، علماء مصلحت ہیں، عوام خوفزدہ اور راضی برضائے حاکم، دانشور خوشامدی اور ادارے کھوکھلے ہو جائیں (رہے ہم جیسے لوگ جو تجارت سے وابستہ ہیں تو) کامل اس فرقہ تبار سے نکلا نہ کوئی) تو جمہوریت آہستہ آہستہ آمریت کو راہ دیتی چلی جاتی ہے۔ پھر کوئی طالع آزا آمر ملک کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کے حالات پر نظر ڈالیے۔ ڈکٹیٹر خود نہیں آتا۔ لایا اور بلایا جاتا ہے۔ اور جب آ جاتا ہے تو قیامت اس کے ہم رکاب آتی ہے۔ پھر وہ روایتی اونٹ کی طرح بدوؤں کو خیمے سے نکال باہر کرتا ہے۔ باہر نکالے جانے کے بعد کھیانے بدو ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتے ہیں۔ پھر ایک نایاب بلکہ عنقا شے کی جستجو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اپنے سے زیادہ غبی اور تابعدار اونٹ تلاش کر کے اسے دعوت دینے کے منصوبے بناتے لگتے ہیں تا کہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنے خیمے میں رہ سکیں۔ اور آقائے سابق الانعام یعنی پچھلے اونٹ پر تبرا بھیج سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈکٹیٹر سے زیادہ مخلص اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس معنی میں کہ وہ خلوص دل سے یہ سمجھتا ہے

کہ ملک و ملت سے جس طرح ٹوٹ کر وہ محبت کرتا ہے اور جیسی اور جتنی خدمت وہ تنہا کر سکتا ہے، وہ پوری قوم کے بوتے کا کام نہیں۔ وہ سچ مچ محسوس کرتا ہے کہ اس کے جگر میں سارے جہاں کا درد ہی نہیں، درماں بھی ہے۔ نیز اسی کی ذات واحد خلاصہ کائنات اور بلا شرکت غیرے سرچشمہ ہدایت ہے۔ لہذا اس کا ہر فرمان بمنزلہ صحیفہ ساوی ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ فرامیں خیال میں
اس میں شک نہیں کہ اس کے پاس ان لا مسائل (Non-Issues)
اور فرضی قضیوں کا نہایت اطمینان بخش حل ہوتا ہے جو
وہ خود اپنی جودت طبع سے کھڑے کرتا ہے۔ یہ کہنا غلط
نہ ہو گا کہ اخباری معے (کراس ورڈ) بنانے والوں کی طرح
پہلے وہ بت سے حل اکٹھے کر لیتا ہے اور پھر اپنے ذہن
معمہ ساز کی مدد سے ان سے آڑے ترچھے مسائل گھڑتا
چلا جاتا ہے۔

رائے کی قطعیت اور اقتدار کی مطلقیت کا لازمی شاخسانہ
یہ کہ وہ بندگان خدا سے اس طرح خطاب کرتا جیسے وہ
سب پتھر کے عہد کے وحشی ہوں۔ اور وہ انہیں ظلمت سے
نکل کر اپنے دور نابخدائی میں لانے اور بن مانس سے آدمی
اور آدمی سے انسان بنانے پر مامور من اللہ ہے۔ وہ ہمہ
وقت اپنی شیشہ پلائی ہوئی دیوار سے خطاب کرتا رہتا ہے
مگر قد آدم حروف میں اس پر لکھا ہوا نوشتہ اسے نظر نہیں
آتا۔ مطلق العنانیت کی جزیں دراصل مطلق الانانیت سے
پیوست ہوتی ہیں۔ چنانچہ اوامر نواہی کا انحصار اس کی جنبش
ابرو ہوتا ہے۔ انصاف کی خود ساختہ ترازو کے اونچے نیچے
پلڑوں کو اپنی تلوار کا پاسنگ کبھی اس پلڑے اور کبھی اس

پلڑے میں ڈال کر برابر کر دیتا ہے۔ ”ہر کہ آمد عدالت نو ساخت“ ایسی سرکار دولت مدار کو ما بدولت مدار کہتا زیادہ مناسب ہو گا۔ نقل کفر، کفر نہ باشد، مرزا عبدالودود بیگ تو (جو ابتدا میں ہر حکومت کی زور شور سے حمایت اور آخر میں اتنی ہی شد و مد سے مخالفت کرتے ہیں) ایک زمانے میں اپنے کان پکڑتے ہوئے یہاں تک کہتے تھے کہ اللہ معاف کرے میں تو جب اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رجیم سے یہی Regime مراد ہے! نعوذ باللہ۔ ثم نعوذ باللہ۔ پھر جیسے امور سلطنت پر وفور تمکنت اور ہوس حکمرانی غالب آتی ہے، آمر اپنے ذاتی مخالفین کو خدا کا منکر اور اپنے چاکر ٹولے کے نکتہ چینوں کو وطن کا غدار اور دین سے منحرف قرار دیتا ہے اور جو اس کے دست آہن پوش پر بیعت میں غلبت سے کام نہیں لیتا ان پر اللہ کی زمین کا رزق، اس کی چھاؤں اور چاندنی حرام کر دینے کی بشارت دیتا ہے۔ ادیبوں اور تلامیذ الرحمن کو شاعری مطبخ کی بریانی کھلا کر یہ بتاتا ہے کہ لکھنے والے کے کیا فرائض ہیں اور نمک حرامی کسے کہتے ہیں۔ وہ یہ جانتا ہے کہ ادب اور صحافت میں ضمیر فروش سے بھی زیادہ مفید مطلب ایک اور قبیلہ ہوتا ہے جسے مافی الضمیر فروش کہنا چاہیے۔ اس سے وہ تصدیق کراتا ہے کہ میرے عہد میں اظہار و ابلاغ پر کوئی قدغن نہیں۔ مطلب یہ کہ جس کا جی چاہے، جس زمین اور جس بحر میں قصیدہ کہے۔ قطعاً کوئی روک ٹوک نہیں۔ بلکہ وزن، بحر اور عقل سے خارج ہو تب بھی ہم خارج نہیں ہوں گے۔ بامثال امر، قصائد نو کے انبار لگ جاتے ہیں۔

روز اک تانہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
جیسے اور دور گزر جاتے ہیں، یہ دور بھی گزر گیا۔ لیکن کچھ
لوگ ایسے خوف زدہ اور چڑھتے سورج کی پرستش کے اتنے
عادی ہو گئے تھے کہ سورج ڈوبنے کے بعد بھی سجدے میں
پڑے رہے کہ نہ جانے پھر کب اور کدھر سے نکل آئے۔
کبھی کسی نے گولی بھر کے زبردستی کھڑا کرنا چاہا بھی تو

معلوم ہوا کہ کھڑے نہیں ہو سکتے۔ جوڑ بند سب اکڑ کر رہ گئے ہیں اور اب وہ اپنے تمام معمولات اور فرائض منصبی اور غیر منصبی حالتِ سجود ہی میں ادا کرنے کے عادی و خوگر ہو گئے ہیں۔ یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا۔

ارجنٹائن ہو یا الجزائر، ترکی ہو یا بنگلہ دیش یا عراق و مصر و شام، اس دور میں تیسری دنیا کے تقریباً ہر ملک میں یہی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ سیٹ، مکالمے اور ماسک کی وقتی اور مقامی تبدیلیوں کے ساتھ۔

متذکرہ صدر دس تحریریں، جو اپنی ساخت، ترکیب اور دانستہ و آراستہ بے ترتیبی کے اعتبار سے مونٹاژ اور پھیلاؤ کے لحاظ سے ناول سے زیادہ قریب ہیں، اسی دور ضیاع کا انتخاب ہیں۔ ان میں سے صرف پانچ اس کتاب میں شامل ہیں۔ کہتے ہیں کسی نے امینول جوزف سائیز سے پوچھا کہ آپ نے انقلاب فرانس میں کون سا شاندار کارنامہ انجام دیا تو اس نے جو سہ لفظی جواب دیا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا۔ "J'ai Vecue" (survived) یعنی میں اپنے آپ کو بچا لے گیا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں میں خود کو اپنے آپ سے بھی بچا پایا یا نہیں۔ وطن اور احباب سے گیارہ سال دوری اور مجبوری کا جو اثر طبیعت پر مرتب ہوتا ہے، اس کی پرچھائیاں آپ کو جہل تماں ان تحریروں میں نظر آئیں گی۔ یوں لندن بہت دلچسپ جگہ ہے اور اس کے علاقہ بظاہر اور کوئی خرابی نظر نہیں آتی کہ غلط جگہ واقع ہوا ہے۔ تھوڑی سی بے آراہی ضرور ہے۔ مثلاً مطلع ہمہ وقت ابر و کمر آلود رہتا ہے۔ صبح اور شام میں تمیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے لوگ AM اور PM بتانے والی ڈائل کی گھڑیاں پہنتے ہیں۔ موسم ایسا جیسے کسی کے دل میں بغض بھرا ہو۔ گھر اتنے چھوٹے اور گرم کہ محسوس ہوتا ہے کمرہ اوڑھے پڑے ہیں۔ پھر بقول ملک الشعراء فلپ لارکن یہ کیسی مجبوری کہ

"Nowhere to go but indoors!"

روشن پہلو یہ کہ شائستگی، رواداری اور بردباری میں انگریزوں کا جواب نہیں۔ مذہب، سیاست اور سیکس پر کسی اور کیسی بھی محفل میں گفتگو کرنا خلافِ تہذیب اور انتہائی معیوب حالت

میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ بے حد خوش اطوار اور ہمدرد۔ کار والے اتنے خوش اخلاق کے اکلوتے پیدل چلنے والے کو راستہ دینے کے لیے اپنی اور دوسروں کی راہ کھوٹی کر کے سارا ٹریفک روک دیتے ہیں۔ مرزا عبدالودود بیگ کہ سدا کے جذباتی ٹھہرے، سر راہ اپنی اس توقیر سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ بے تحاشا جی چاہتا ہے زہرا لائن پر ہی کھڑے ہو کر پہلے سب کو جھک جھک کر فرداً فرداً کورنش بجا لائیں، پھر سڑک کراس کریں۔ مختصر یہ کہ کنج قفس میں اچھی گزرتی ہے۔

قفس میں کوئی اذیت نہیں مجھے صیاد
بس ایک حشر پاپا بال و پر میں رہتا ہے

کوئی لکھنے والا اپنے لوگوں، ہم عصر ادیبوں، ملکی ماحول و مسائل، لوک روایت اور کچھ سے کٹ کر کبھی کوئی زندہ اور تجربے کی دہکتی کھالی سے نکلا ہوا فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ برطانیہ میں رہنے والے ایشیائیوں میں سو میں سے ننانوے ان خوبصورت درختوں کے نام نہیں بتا سکتے جو ان کے مکانوں کے سامنے نہ جانے کب سے کھڑے ہیں۔ (رہا سواں آدمی، سو اس نے درختوں کو کبھی نوٹس ہی نہیں کیا) نہ ان رنگ برنگے پرندوں کے نام جو منہ اندھیرے اور شام ڈھلے ان پر چھماتے ہیں اور نہ اس گرل فرینڈ کے بالوں کا شیڈ بتا سکتے ہیں جس کے ساتھ رات بھر بڑی روانی سے غلط انگریزی بولی۔ گولڈن آبرن، کاپر آبرن، ایش بلانڈ، چیسٹ نٹ براؤن، ہیزل براؤن، برگنڈی براؤن؟ کچھ معلوم نہیں۔ ان کی خیرہ نگاہیں تو، جو کچھ بھی ہو خدا کی قسم لا جواب ہو، کے فلمی مقام پر آ کر ٹھہر جاتی ہیں۔ غیر ملک کی زندگی اور معاشرے کا مشاہدہ اور اس کے مسائل کی تفہیم اور گرفت اتنی سرسری اور سطحی ہوتی ہے کہ کبھی میوزیم، آرٹ گیلری، تھیٹر، ناٹ کلب، سوہو کی شب تاب گلیوں کے طواف، ایٹ اینڈ میں ذلت آمیز ”مگنگ“ یا چیئرنگ کراس پر گاہک کی مختصر شب زادیوں کی عنایات عاجلہ سے آگے نہیں بڑھ

پاتی۔ بہت تیر مارا تو برطانوی شہریت حاصل کر کے وہ رنی سہی عزت بھی گنوا دی جو ٹورسٹ یا مہمان مزدور کی حیثیت سے حاصل تھی، یا بیک وقت برٹش پاسپورٹ اور ”اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام“ لینے کی غرض سے کسی انگریز عورت سے شادی کر لی اور اپنے حسابوں سارے انگلستان کی ازار بندی رشتے سے مشکلیں کس دیں۔ تک سک اور نسلی اعتبار سے انگریزوں کا ”اشاک“ بہت اچھا ہے۔ قد کاٹھ، رنگ روپ اور تیکھے ترشے نقوش کے لحاظ سے ان کا شمار خوبصورتوں میں ہوتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ بد صورت انگریز عورت Rarity (نایاب) ہے۔ بڑی مشکل سے نظر آتی ہے۔ یعنی ہزار میں ایک۔ پاکستانی اور ہندوستانی اسی عورت سے شادی کرتا ہے۔ لیکن انگریز عورت کو حوالہ نکاح میں لانے سے نہ تو انگلستان فتح ہوتا ہے، نہ سمجھ میں آتا ہے۔ بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے خود عورت بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ چنانچہ جلا وطن ادیب (خواہ اس نے بہتر تنخواہ اور بدتر سلوک کی خاطر خود کو ملک بدر کیا ہو یا ذاتی اور سیاسی مجبوری کے تحت آسودہ حال جلا وطنی اختیار کی ہو) ہر پھر کر اسی چھوڑی ہوئی منزل اور گزری ہوئی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے جسے ”مردِ ایام“ غربت اور فاصلے نے اب آؤٹ آف فوکس کر کے گلیمرائز بھی کر دیا ہے۔ جلا وطن وہاٹ رومی ادیب اس کی بہترین مثال ہیں۔ لندن میں مقیم یا آباد اردو ادیبوں کا بھی کچھ ایسا ہی احوال ہوا۔

کوئی ان کی بزمِ جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا

لندن میں اس رائدہ زرگاہ پر کیا گزری اور کیسے کیسے باب ہائے خرد افروز ہوئے، یہ ایک الگ داستان ہے جس میں کچھ ایسے پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں جو صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں۔ اسے انشاء اللہ جلد ایک علاحدہ کتاب کی شکل میں پیش کروں گا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ”زرگشت“ کی اشاعت کے بعد ارادہ تھا کہ کوچہ

سود خواراں میں اپنی خواری کی داستان آخری باب میں جمل ختم ہوئی ہے، وہیں سے دوسری جلد کا آغاز کروں گا۔ لیکن درمیان میں لندن، ایک اور بینک، ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف اور ”آبِ گم“ آ پڑے۔ کچھ اندیشہ ہائے دور و دراز بھی ستانے لگے۔ مثلاً یہی کہ میرے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمزاد یہ نہ سمجھیں کہ بینکنگ کیریئر تو محض کیمو فلاٹ اور بہانہ تھا۔ دراصل یکم جنوری ۱۹۵۰ء یعنی ملازمت کے روز اول ہی سے میری نیت میں فتور تھا۔ محض مزاح نگاری اور خود نوشت کے لیے سوانح اکٹھے کرنے کی غرض سے فقیر اس حرام پیٹھے سے وابستہ ہوا (وہ بھی کیا زمانہ تھا جب حرام پیسے کی صرف ایک ہی شکل ہوا کرتی تھی، سود) دوسری حوصلہ شکن الجھن جو زرگزشت حصہ دوم کی تصنیف میں مانع ہوئی، یہ تھی کہ یہ اردو فکشن ناموں کی شکل میں۔ افسانے اور ناول ان کی گرد کو نہیں پہنچتے۔ افسوس، میرے یہل سوانح کا اتنا فقدان ہے کہ تادم تحریر زندگی کا سب سے اہم واقعہ میری پیدائش ہے (بچپن کا سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ یہ تھا کہ بڑا ہو گیا) اور غالباً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ اس پر میں کوئی تین ایکٹ کا سنسنی خیز ڈراما نہیں لکھ سکتا۔ تیسرا سبب خامہ خود بین و خود آرا کو روکے رکھنے کا یہ کہ اس اثنا میں لارڈ کونٹن کے تاثرات نظر سے گزرے۔ وہ ٹریفی کالج، آکسفورڈ کا پریزیڈنٹ اور بورڈ آف برٹش لائبریری کا چیئرمین ہے۔ علمی و ادبی حلقوں میں عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے ذاتی کتب خانے میں بیس ہزار سے زائد کتابیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں خود نوشت سوانح عمری کو سوانح عمری کے ساتھ کبھی نہیں رکھتا مزاح کی الماری میں رکھتا ہوں۔ عاجز اس کی ذہانت پر ہفتوں عش عش کرتا رہا کہ اس کی خود نوشت سوانح نو عمری زرگزشت پڑھے بغیر وہ زیرک اس نتیجے پر کیسے پہنچ گیا۔ ابھی اگلی طرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

اس مجموعے کے بیشتر کردار ماضی پرست، ماضی زدہ اور مردم گزیدہ ہیں۔ ان کا اصل مرض ناشل جیا ہے۔ زمانی اور مکانی، انفرادی اور اجتماعی۔ جب انسان کو ماضی، حال سے زیادہ

پرکش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر اتنا ہی بند ہو جائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بڑھاپے کا جوانی لیوا حملہ کسی بھی عمر میں، بالخصوص جوانی میں ہو سکتا ہے۔ اگر افیم یا ہیروئین دستیاب نہ ہو تو پھر اسے یاد ماضی اور فینٹسی میں جو تھکے ہاروں کی آخری پناہ گاہ ہے، ایک گوند سرخوشی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے کچھ حوصلہ مند اور جفاکش لوگ اپنے زور بازو سے اپنا مستقبل بناتے ہیں، اسی طرح وہ زور تخیل سے اپنا ماضی آپ بنا لیتا ہے۔ یادوں کا سر شور دیا دشت امروز میں بستے بستے خواب سراب کے آبِ گم میں اتر جاتا ہے۔ پھر اندر ہی اندر کہیں ابھرتی گم ہوتی سوت ندیوں اور کہیں کاریزوں کی صورت، خیال بگولوں میں بوئی ہوئی کھیتی کو سینچتا رہتا ہے۔ اور کہیں اچانک کسی چٹان سے چشمہ آبِ زندگانی بن کے پھوٹ نکلتا ہے۔

کبھی کبھی قومیں بھی اپنے اوپر ماضی کو مسلط کر لیتی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ایشیائی ڈرامے کا اصل ولن ماضی ہے۔ جو قوم جتنی پسماندہ، درماندہ اور پست حوصلہ ہو اس کو اپنا ماضی، معکوس اقلیدس تناسب (Inverse Geometrical Ratio) میں اتنا ہی زیادہ درخشاں اور دہرائے جانے کے لائق نظر آتا ہے۔ ہر آزمائش اور ادبار و ابتلا کی گھڑی میں وہ اپنے ماضی کی جانب راجع ہوتی ہے۔ اور ماضی بھی وہ نہیں کہ جو واقعتاً تھا، بلکہ وہ جو اس نے اپنی خواہش اور پسند کے مطابق از سر نو گھڑ کر آراستہ پیراستہ کیا ہے۔ ماضی تمنائی، اس پاکستان طرازی کے پس منظر میں مجروح اتنا کا طاؤسی رقص دیدنی ہوتا ہے کہ مور فقط اپنا ناچ ہی نہیں، اپنا جنگل بھی خود ہی پیدا کرتا ہے۔ ناچتے ناچتے ایک طلسماتی لمحہ ایسا آتا ہے کہ سارا جنگل ناچنے لگتا ہے اور مور خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ناٹل جیا اسی لمحہ منجمد کی داستان ہے
 ٹکست خوردہ اتنا اپنے لیے کہاں کہاں اور کیسی کیسی پناہیں
 تراشتی ہے، یہ اپنے اپنے ذوق، طرف، تاب، ہزیمت اور

طاقت فرار پر منحصر ہے۔ 'تصوف' 'تقشف' 'مراقبہ' 'شراب' 'مزاح' 'سکس' 'ہیروئین' 'ویلیم' ماضی تمنائی' فینٹسی (خواب نیم رونا جس کو جو نشہ راس آ جائے۔ آرنلڈ نے بار جانے والے مگر ہار نہ ماننے والے' دھیان دھول میں لت پت مشرق کی ہار سار کے بارے میں لکھا تھا۔

The East bow'd low before the blast
In patient, deep disdain
She let the legions thunder past
And plunged in thought again.

اور اس مغرور مراقبے میں صدیاں بیت جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ خواب آور اور گہرا نشہ جو انسان کو حاضر و موجود سے بے نیاز کر دیتا ہے' خود اپنے لو میں کسی خواب یا خیال کے فشار و آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بے خودی میسر آ جائے تو پھر سب گوارا' سب کچھ پذیرا۔

ہزار آشفتمندی مجموعہ یک خواب ہو جائے

صاحبِ مراء الخیال سے روایت ہے کہ جب کفر و برہنگی کے الزام میں سرمد کو پابجواں شہادت گاہ لے جایا گیا تو وہ تنگ بکھت جلاد کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ اور گویا ہوا "ندائے تو شوم! بیا بیا کہ تو بہر صورتی آئی من تر خواب ی شناسم" پھر یہ شعر پڑھا اور سر تلواری کے نیچے رکھ کر ابدی نیند سو گیا۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

Urdu4U.com

قدیم زمانے میں چین میں دستور تھا کہ جس شخص کا مذاق اڑانا مقصود ہوتا، اس کی ناک پر سفیدی پوت دیتے تھے۔ پھر وہ دکھیا کتنی بھی گبیر بات کتا، کلاؤن ہی لگتا تھا۔ کم و بیش یہی حشر مزاح نگار کا ہوتا ہے۔ وہ اپنی فوٹس کیپ اتار کر پھینک بھی دے تو لوگ اسے جھاڑ پونچھ کر دوبارہ پٹنا دیتے ہیں۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ کوچہ سود خواروں میں سر پر دستار ری یا نہیں، تاہم آپ اس کتاب کا موضوع، مزاج اور ذائقہ مختلف پائیں گے۔ موضوع اور تجربہ خود اپنا پیرایہ اور لہجہ متعین کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال خدا کے حضور مسلمانوں کا شکوہ اپنے استاد فصیح الملک داغ دہلوی کی نثرے چونچلے کرتی زبان میں نہیں لکھ سکتے تھے۔ رسوا کی امراء و جان ادا اور طوائفوں سے متعلق منٹو کے افسانوں کا ترجمہ اگر مولانا ابوالکلام آزاد کی جناتی زبان میں کر کے انہیں (طوائفوں کو) بالجر سنایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ایک ہی صفحہ سن کر کان پکڑ لیں اور اپنے دھندے سے تائب ہو جائیں۔ وہ تو وہ، خود ہم اپنے طرز نگارش و معاش سے توبہ کر لیں کہ آج وہ، کل ہماری باری ہے۔ ہر کیف اس بار موضوع، مواد اور مشاہدات سب قدرے مختلف تھے۔ سو وہی لکھا جو دیکھا۔ قلندر ہرچہ گویدہ گویدہ۔

قصہ گو قلندر کو اپنی عیاری یا راست گفتاری کا کتنا ہی زعم ہو، اور اس نے اپنا سر کتنا ہی باریک کیوں نہ ترشوار رکھا ہو، باندگان حرف و حکایت کی پرانی عادت ہے کہ کہانی کا تانا بانا بنتے بنتے اچانک اس کا رنگ، رخ اور ذائقہ بدل دیتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہانی کہتے کہتے خود کہنے والے کو کچھ ہو جاتا ہے۔ وہ پھر وہ نہیں رہتا کہ جو تھا۔ سو کچھ ایسی ہی واردات اس نامہ سیاہ راقم سطور کے ساتھ ہوئی۔
وانہ هو الخٹک و ابکی۔

چنگ را گیرید از دستم کہ کار از دست رفت
نغمہ ام خون گشت و از رگمائی ساز آید بروں

یہ نہ ادعا ہے، نہ اعتذار، فقط گزارش احوال واقعی ہے۔

بھلا اللہ میں اپنی طبعی اور ادبی عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں انسان تحسین اور تنقیص دونوں سے اس درجہ مستغنی ہو جاتا ہے کہ ناکردہ تک کا اطراف کرن لا میں حجاب محسوس نہیں کرتا۔ چنانچہ اب مجھے ”کے کہ خداں نہ شد از قبیلہ مانیت“ پر اصرار کے باوجود یہ اقرار کرنے میں خجالت محسوس نہیں ہوتی کہ میں طبع اصولا اور عاداتا یاس پسند اور بہت جلد شکست مان لینے والا آدمی ہوں۔ قنوطیت غالباً مزاح نگاروں کا مقدر ہے۔ مزاح نگاری کے باوا آدمی ڈین سوٹ پر دیوانگی کے دورے پڑتے تھے اور اس کی یاس پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنی پیدائش کو ایک المیہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ اپنی سالگرہ کے دن بڑے التزام سے سیاہ ماتمی لباس پہنتا اور فاقہ کرتا تھا۔ مارک نوین پر بھی اخیر عمر میں کلبیت طاری ہو گئی تھی۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان مشاہیر مختشم سے تمہاری مماثلت بس اسی حد تک ہے۔ بہر حال، قبل از وقت مایوس ہو جانے میں ایک فائدہ یہ دیکھا کہ ناکامی اور صدمے کا ڈنک اور ڈر پہلے ہی نکل جاتا تھا۔ بعض نامور پہلوانوں کے گھرانوں میں یہ رواج ہے کہ ہونہار لڑکے کے بزرگ اس کے کان بچپن میں ہی توڑ دیتے ہیں، تا کہ آگے چل کر کوئی ناہنجار مخالف پہلوان توڑنے کی کوشش کرے تو ذرا تکلیف نہ ہو۔ مزاح کو میں دفاعی میکانزم سمجھتا ہوں۔ یہ تلوار نہیں، اس شخص کا زہر بکتر ہے جو شدید زخمی ہونے کے بعد اسے پن لیتا ہے۔ زین بدھ ازم میں ہنسی کو گیان کا زینہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو اونچ نیچ کا سچا گیان اس سے پیدا ہوتا ہے جب کھبے پر چڑھنے کے بعد کوئی نیچے سے سیڑھی ہٹا لے۔ مگر ایک کماوت یہ بھی سنی کہ بندر پیڑ کی پھنگ سے زمین پر گر پڑے تب بھی بندر ہی رہتا ہے۔

”حویلی“ کی کہانی ایک متروکہ ڈھنڈار حویلی اور اس کے مغلوب الغضب مالک کے گرد

گھومتی ہے۔ ”سکول ماسٹر کا خواب“ ایک دکھی گھوڑے، حجام اور منشی سے متعلق ہے۔
 ”شہر دو قصہ“ ایک چھوٹے سے کمرے اور اس میں پچتر سال گزار دینے والے سکی آدمی
 کی کہانی ہے۔ ”دھیرج گنج“ کا پہلا یادگار مشاعرہ“ میں ایک قدیم قصبائی سکول اور اس
 کے ایک ٹیچر اور بانی کے کیری کچور پیش کئے گئے ہیں اور ”کار کاہلی والا اور الہ دین
 بے چراغ“ ایک کھٹارا کار، ناخواندہ پٹھان آڑھتی اور شیخی خورے اور لپاڑی ڈرائیور کا
 حکایتی طرز میں ایک طویل خاکہ ہے۔ ان میں جو کردار مرکزی، ثانوی یا محض ضمنی حیثیت
 سے ابھرتے ہیں، وہ سب کے سب اصطلاح بہت ”عام“ اور سماجی رتبے کے لحاظ سے
 بالکل ”معمولی“ ہیں۔ اسی لے خاص اتفاقات اور تامل چاہتے ہیں۔ میں نے زندگی کو ایسے
 ہی لوگوں کے حوالے سے دیکھا، سمجھا، پرکھا اور چاہا ہے۔ اسے اپنی بد نصیبی ہی کہنا
 چاہیے کہ جن ”بڑے“ اور ”کامیاب“ لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، انہیں
 بحیثیت انسان بالکل ادھورا، گرہ دار اور یک رخا پایا۔ کسی دانہ کا قول ہے کہ جس کثیر
 تعداد میں قادر مطلق نے عام آدمی بنائے ہیں، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں
 بنانے میں اسے خاص لطف آتا ہے، ورنہ اتنے سارے کیوں بناتا۔ اور قرن ہا قرن
 سے کیوں بناتا چلا جاتا۔ جب ہمیں بھی یہ اتنے ہی اچھے اور پیارے لگنے لگیں تو جاننا
 چاہیے کہ ہم نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ یہ ایسے ہی عام انسانوں کا تذکرہ ہے۔ ان
 کی الف لیلیٰ ایک ہزار ایک راتوں میں بھی ختم نہیں ہو سکتی کہ ”ہے ہر اک فرد
 جہاں میں ورق ناخواندہ“

ممکن ہے بعض طبائع پر جزئیات کی کثرت اور ”پلاٹ“ کا فقدان گراں گزرے۔ میں
 نے پہلے کسی اور ضمن میں عرض کیا ہے کہ پلاٹ تو قلموں، ڈراموں، ناولوں اور سازشوں
 میں ہوتا ہے۔ ہمیں تو روزمرہ کی زندگی میں دور دور اس کا نشان نہیں ملا۔ رہی جزئیات
 نگاری اور باریک بینی تو اس میں فی نفسہ کوئی عیب نہیں اور نہ خوبی۔ جزئیات اگر محض
 خوردہ گیری پر مبنی نہیں، اور سچی اور جاندار ہیں تو اپنی کہانی اپنی زبانی کہتی چلی جاتی
 ہے۔ انہیں توڑ مروڑ کر افسانوی سانچے میں ڈھالنے یا کسی آدرشی شے میں کسنے کی ضرورت

نہیں۔ گگول، چیخف اور کلاڈ سیمون زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات اپنے کینوس پر بظاہر بڑی لاپرواہی سے بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ پروست نے ایک پورا ناول ایک ڈنر پارٹی کی تفصیل بیان کرنے میں لکھ دیا جو یادوں کے Total Recall (مکمل باز آفرینی) کی بہترین مثال ہے۔ انگریزی کے عظیم ترین (بغیر پلاٹ کے ناول Ulysses کی کہانی ۱۶ جون ۱۹۱۶ء کو صبح آٹھ بجے شروع ہو کر اسی دن ختم ہو جاتی ہے۔ یوجین اونیل کے ڈرامے Long Day's Journey Into Night کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ ان شاہکاروں کا حوالہ دینے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر میری کچھ بات نہیں بنی تو یہ تکنیک کا قصور نہیں، سراسر میری کم سوادی اور بے ہنری ہے کہ پیڑ گنتا رہ گیا، جنگل کا سماں نہ دکھلا سکا۔ آبشار نیاگرا کی ہیبت اور بلندی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھنا ضروری ہے۔ میں جتنی بار اوپر دیکھتا ہوں، کلاہ پندار قدموں پر آن پڑتی ہے۔

یہاں ایک ادبی بدعت اور بد مذاقی کی وضاحت اور معذرت ضروری سمجھتا ہوں۔ فارسی مصرعوں اور اشعار کے معنی فٹ نوٹ یا قوسین میں دینے کی دو وجہیں ہیں۔ اولاً نئی نسل کے پڑھنے والوں کو ان کے معنی معلوم نہیں۔ دوم، خود مجھے بھی معلوم نہیں تھے۔ تفصیل اس اجمال پر ملال کی یہ کہ عاجز نے باقاعدہ فارسی صرف چار دن چوتھی جماعت میں پڑھی تھی اور ”آمد نامہ“ کی گردان سے اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ ڈرائنگ لے لی۔ ہر چند کہ اس میں گردان نہیں تھی لیکن مقامات آہ و فغاں کہیں زیادہ نکلے۔ اس میں میٹرک تک میری مہارت صراحی اور طوطا بنانے سے آگے نہ بڑھ پائی۔ اور میں ہر دو اشیاء ڈرائنگ میں اسپیشلائز کرنے سے پہلے بھی بالکل ویسی ہی بنا سکتا تھا۔ ڈرائنگ ماسٹر کہتا تھا کہ تم اپنا نام اتنی محبت اور محنت سے لکھتے ہو کہ تمہاری Lettering (حرف کشی) اتنی خوبصورت ہے کہ تمہیں فیل کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر تم اسکیج کے نیچے یہ نہ لکھو کہ یہ انگور کی بیل ہے تو تمہیں گھڑونجی بنانے کے سو میں سے

سو نمبر ملیں گے۔

تین کرم فرما ایسے ہیں جو بخوبی جانتے ہیں کہ میں فارسی سے نااہل ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے خطوط اور گفتگو میں صرف فارسی اشعار سے میری چاند ماری کرتے ہیں۔ دس بارہ برس تو میں ستائشی حیرت، دوستانہ درگزر اور مودبانہ نافرمانی کے عالم میں یہ سب کچھ جھیلتا رہا۔ پھر اوسان درست ہوئے تو یہ وتیرہ اختیار کیا کہ اپنے جن احباب کے بارے میں مجھے بخوبی علم تھا کہ فارسی میں ان کی دست گاہ میرے برابر (یعنی صفر) ہے، انہیں ان کے اشعار سے ڈھیر کرنے لگا۔ اس عمل سے میری توقیر اور رعب فارسی دانی میں دس گنا اضافہ اور لطف صحبت و مراسلت میں اسی قدر کمی ہو گئی۔ اس کتاب میں فارسی کے جو اشعار یا مصرعے جہاں جہاں نظر آئیں وہ ان ہی تین کرم فرماؤں کے بے طلب عطایا میں سے ہیں۔ یہ ہیں درویش بے یا و ریش برادر منظر الہی شیخ (مصنف در دل کشا اور سلسلہ روز و شب) جو پرش حال کے لیے بعرف کثیر لاہور سے لندن انٹرنیشنل کال بھی کریں تو پہلے علالت و عیادت سے متعلق فارسی اشعار سناتے ہیں۔ پھر میری فرمائش پر ان کا اردو ترجمہ و تشریح۔ اتنے میں وقت ختم ہو جاتا ہے اور آپریٹر لائن کٹ دیتا ہے۔ دوسرے دن وہ مجھے محبت، معذرت اور فارسی اشعار سے لبریز خط لکھتے ہیں کہ معاف کیجئے، آپ کا آپریشن کس چیز کا ہوا تھا۔ اور اب طبیعت کیسی ہے۔ جب سے سنا ہے بہت تردد ہے۔ وقت ضائع کرنے پر سعدی نے کیا خوب کہا ہے مگر بیدل نے اسی مضمون کو کہاں سے کہاں سے پہنچا دیا، واہ وا۔ دوسرے کرم فرما ہیں، ڈاکٹر ضیاء الدین کلیب کہ جب بھی برٹش لائبریری جاتے ہیں، بک اسٹال سے ایک خوبصورت اور سمجھ میں آنے والا تصویری پوسٹ کارڈ خریدتے ہیں۔ پھر اس پر فیضی، بیدل یا طالب آملی کے شعر سے پانی پھیر کر مجھے پوسٹ کر دیتے ہیں۔ اور تیسرے ہیں حبیب لیب و صاحب طرز ادیب محبی مختار مسعود جو عاجز کے وسیع و عمیق علمی خلا کو پر کرنے سے ربع صدی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اپنے دل پسند موضوعات پر گھنٹوں ہمارے آگے بین بجاتے اور مجبوراً خود ہی جھومتے رہتے ہیں۔ کئی بار ان سے

پوچھا، حضور والا! آپ کو یہ کیسے پتا چل جاتا ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں۔ مگر وہ کسر نفسی سے کام لیتے ہیں۔ خود ذرا کریڈٹ نہیں لیتے۔ بس آسمان کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ اور اسی انگلی سے اپنا کان توبہ کے انداز میں پکڑ کر اگر بیٹھے ہوں تو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کھڑے ہوں تو بیٹھ جاتے ہیں۔ انکسار و استغفار کے مخلوط اظہار کے لیے یہ ان کی ادائے خاص ہے، جس کے دوست دشمن سب قتل ہیں۔

فارسی اشعار کے جو معنی آپ حواشی میں ملاحظہ فرمائیں گے، وہ ان ہی کرم فرماؤں سے پوچھ کر لکھ دیے ہیں تا کہ سند رہے اور بھول جاؤں تو دوبارہ ان سے رجوع نہ کرنا پڑے۔ خصوصاً مختار مسعود صاحب سے کہ جب سے وہ آری ڈی کے سلسلے میں ترکی کے سرکاری پھیرے لگا آئے ہیں وہ مزار پیر رومی کے نواح میں درویشوں کا والہانہ رقص پیشم حیراں دیکھ آئے ہیں، فارسی اشعار کا مطلب ہمیں ترکی کے حوالے سے سمجھانے لگے ہیں۔ یوں تو ہم اپنے ایک اور دیرینہ کرم فرما، پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی سے بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ آسان شعر کو بھی اپنے علم کے زور اور دُور سے ناقابل فہم بنا دیتے ہیں۔

آسان ز توجہ تو مشکل
مشکل ز تجاہل تو آسان

سچ تو یہ ہے کہ فارسی شعر کی مار آج کل کے قاری سے سہی نہیں جاتی۔ بالخصوص اس وقت جب وہ بے محل بھی ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد تو نثر کا آرائشی فریم صرف اپنے پسندیدہ فارسی اشعار ٹانگنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان اشعار بے محل نہیں ہوتے۔ ملاحظہ نثر بے محل ہوتی ہے۔ وہ اپنی نثر کا تمام تر ریشمی کوکون (کویا) اپنے گاڑھے گاڑھے لعاب دہن سے فارسی شعر کے گرد بنتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ریشم حاصل کرنے

کا زمانہ قدم سے ایک ہی طریقہ چلا آتا ہے۔ کوئے کو ریشم کے زندہ کیڑے سمیت کھولتے پانی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جب تک وہ مرنے والے ریشم ہاتھ نہیں لگتا۔ مرزا کہتے ہیں کہ کلام غالب کی سب سے بڑی مشکل اس کی شرحیں ہیں۔ وہ نہ ہوں تو غالب کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں غالب واحد شاعر ہے جو سمجھ میں نہ آئے تو دگنا مزا دیتا ہے۔

خدا ان تین عالموں کے درمیان اس فقیر پر تقصیر کو سلامت بے کرامت رکھے۔ جب سے میری صحت خراب ہوئی ہے، ان کی طرف سے مترود رہتا ہوں۔ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد۔

ایک دفعہ میں نے منظور الہی صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے اپنی دونوں کتابوں میں فارسی کے نہایت خوبصورت اشعار نقل کئے ہیں۔ لیکن میری طرح، قارئین کی نئی نسل بھی فارسی نابلد ہیں۔ یوں ہی شد بد اور انکل سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ اگر اگلے ایڈیشن میں بریکٹ میں ان کا مطلب اردو میں بیان کر دیں تو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

سوچ میں پڑ گئے۔ پھر آنکھیں بند کر کے، بند ہونٹوں سے اپنے دلاویز انداز میں مسکرائے۔ فرمایا، مگر بھائی صاحب، پھر مقصد فوت ہو جائے گا۔

اس پر مرزا کہنے لگے ”تم نے اس کتاب میں جو ڈھیر سارے انگریزی الفاظ بے دھڑنگ (مرزا بے درنگ کا یہی تلفظ کرتے ہیں جو ان کے منہ سے بھلا معلوم ہوتا ہے) استعمال کئے ہیں، ان پر بھی یہی فقرہ چست کیا جاسکتا ہے۔ انگریز تو دوسری زبانوں کے الفاظ خاص خاص موقعوں پر دانستہ اور مصلحتاً استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے کھانے پھیکے سیٹھے اور بد مزہ ہوتے ہیں۔ لہذا اعلیٰ رستورانوں میں ان کے نام ہمیشہ فرنج میں دیے جاتے ہیں۔ فرنج آج بھی شائستگی اور سوفسطی کیشن کی زبان تصور کی جاتی ہے۔ لہذا انگریزوں کو کوئی آرنسٹک یا ناشائستہ بات کہنی ہو تو جھٹ فرنج فقرے کا گھونگھٹ نکال لیتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ سیمول سپیس (۱۷۰۳-۱۷۳۳) نے اپنی شرہ آفاق ڈائری

(جس میں اس نے اپنی آوارگیوں اور شبینہ فتوحات کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے) شارٹ ہینڈ میں لکھی تھی تا کہ اس کے ملازم نہ پڑھ سکیں۔ جہاں کوئی ایسا نازک مقام آتا جسے انگریز اپنی روایتی کسر بیانی (Understatement) سے کلم لیتے ہوئے 'Naughty' کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، تو وہ اس واردات کا اندراج فریج میں کرتا تھا۔ لیکن جہاں بات اتنی ناگفتنی ہو جو کہ اکثر ہوتی تھی کہ فریج زبان میں سلگ اٹھے تو وہ اس رات کی بات کو بلا کم کاست ہسپانوی زبان میں قلمبند کرتا تھا۔ گویا یہ ہوئی لسانی درجہ بندی اعتبار مدارج بوالہوسی۔ اب ذرا علوم کی طرف نگاہ کیجئے۔ انگریزوں نے درختوں اور پودوں کے نام اور بیشتر قانونی اصطلاحیں جوں کی توں لاطینی سے مستعار لی ہیں۔ وائائی کی باتیں وہ بالعموم یونانی زبان میں الٹے واوین کے اندر نقل کرتے ہیں تا کہ کوئی انگریز نہ سمجھ پائے۔ اوپیرا کے پکے گانوں کے لیے اٹالین اور فلسفہ کی اوق اصطلاحات کے لیے جرمن زبان کو ترجیح دے کر ناقابل فہم کو ناقابل برداشت بنا دیتے ہیں۔

اس طولانی تمہید کے بعد فرمایا۔ لیکن ہم انگریزی کے الفاظ صرف ان موقعوں پر استعمال کرتے ہیں جہاں ہمیں یقین ہو کہ اس مفہوم کو اردو میں کہیں بہتر طریقے سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

اس بر وقت تنبیہ کے باوجود آپ کو انگریزی الفاظ جا بجا نظر آئیں گے۔ سبب یہ کہ یا تو مجھے ان کے اردو مترادفات معلوم نہیں۔ یا وہ کسی رواں دواں مکالمے کی بہت میں پیوست ہیں۔ بصورت دیگر بہت مانوس اور عام ہونے کے علاوہ اتنے غلط تلفظ کے ساتھ بولے جاتے ہیں کہ اب انہیں اردو ہی سمجھنا چاہیے۔ کوئی انگریز انہیں پہچاننے یا اپنانے کے لیے تیار نہ ہو گا۔

”سکول ماسٹر کا خواب“ اور ”دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ“ پر محب و مشفق درینہ محمد عبدالحمیل صاحب نے بکمال لطف و توجہ نظر ثانی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ جیسے نفاست پسند اور منکسر المزاج وہ خود تھے۔ ویسے ہی جیسے ان کے اعتراضات جو انہوں

نے میرے مسودے کے حاشے پر اتنی ہلکی پنسل سے نوٹ کئے تھے کہ انگلی بھی پھیر دیں تو مٹ جائیں۔ کچھ ایسی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی جن کی اصلاح پر خامہ ہنیاں رقم کسی طور آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مثلاً میں نے ایک ترش مکالے کے دوران گجراتی سیٹھ سے کہلویا تھا۔ ”ہم اس سالے لنگڑے گھوڑے کو لے کے کیا کرے گا؟“ جمیل بھائی کی لکھنوی شائستگی اس کی متحمل نہ ہوئی۔ تادباً پورا جملہ تو نہیں کاٹا، صرف سالے کو قلم زد کر کے اس کے اوپر برادر نسبتی لکھ دیا۔ پھر فرمایا کہ ”حضرت! یہ ہک دک کیا ہوتا ہے؟ ہکا بکا لکھئے۔ ہمارے یہاں ہک دک نہیں بولا جاتا۔“ عرض کیا ”ہکا بکا میں صرف پھٹی پھٹی آنکھیں اور کھلا ہوا منہ نظر آتا ہے، جبکہ ہک دک میں ایسا لگتا ہے جیسے دل بھی دھک دھک سے رہ گیا ہو۔“ فرمایا ”تو پھر سیدھے سجاؤ دھک دھک کرنے لگا کیوں نہیں لکھتے؟ اور ہاں مجھے حیرت ہے کہ ایک جگہ آپ نے لوٹی لکھا ہے، زلت قلم ہی کہوں گا۔ معاف کیجئے۔ یہ لفظ آپ کے قلم کو زیب نہیں دیتا۔“

پوچھا ”تو پھر آپ کے ہاں لوٹی کو کیا کہتے ہیں؟“

فرمایا ”کچھ نہیں کہتے۔“

میں زور سے ہنس دیا تو چونکے۔ دوسرے پہلو پر خیال گیا تو خود بھی دیر تک ہنستے رہے۔ رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”ایسا ہی ہوتا ہے تو اس کی جگہ ”بدتمیز“ لکھ دیجئے۔ تمذیب کا تقاضا یہی ہے۔“ یہ سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ اس لیے کہ میں نے یہ لفظ (بدتمیز) دوسرے ابواب میں تین چار جگہ ایسے لوگوں کے بارے میں استعمال کیا تھا جو صرف لغوی معنی میں بدتمیزی کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس نئے مذہب مفہوم کے ساتھ تو وہ مجھ پر بہتان طرازی اور ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلا سکتے تھے۔

کچھ دیر بعد کلف لگے لمل کے کرتے کی آستین الٹ کر مسودے کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولے ”دواب خانہ، سنگوٹیاں، آر اور جوحنا شرفائے لکھنؤ نہیں بولتے۔“ عرض کیا ”میں نے اسی لیے لکھے ہیں۔“ پھر ک اٹھے، کہنے لگے ”بہت دیر بعد آپ نے ایک

”مجھ داری کی بات کہی۔“ پھر اس خوشی میں سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے
 ”مگر مشتاق صاحب یہ بوک کیا ہوتا ہے؟ ہم نے نہیں سنا۔“ عرض کیا ”جوان اور مست
 بکرا جس سے نسل کشی کے سلسلے میں رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کی واڑھی ہوتی ہے
 اور جسم سے سخت بدبو آتی ہے۔ گوشت بھی بساندہ اور ریشے دار۔“ فرمایا۔ ”واللہ، ہم نے
 یہ لفظ ہی نہیں ایسا بکرا بھی نہیں دیکھا۔ لفظ، مفہوم اور کے گوشت تینوں سے کراہت
 آتی ہے۔“ متقی ہے۔ آپ اس کی جگہ کوئی اور کم بدبو دار جانور استعمال نہیں کر سکتے؟
 کراچی میں اس لفظ کو کون سمجھے گا۔“ عرض کیا ”وہی جو متقی (قے آورا) کو سمجھے گا۔
 آپ تو غالب کے حافظ ہیں۔ آپ کو تو یہ لفظ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ضد کا
 غالب نے عجیب سیاق و سباق میں ذکر کیا ہے۔ علانی کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ
 تم خصی بکروں کے گوشت کے قلنے اڑا رہے ہو گے۔ لیکن بخدا میں تمہارے پلاؤ قلنے
 پر رشک نہیں کرتا۔ خدا کرے تمہیں بیکانیر کی مصری کا ٹکڑا میسر نہ آیا ہو۔ جب
 یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے ٹکڑے کو چبا رہے ہوں گے تو
 رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہوں۔ تحقیق طلب امر یہ کہ اس مصری کی ڈلی سے
 دراصل غالب کی کیا مراد تھی۔ محض مصری؟ سو وہ تو اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی، دلی میں
 منوں دستیاب تھی۔ حیرت ہے محققین و شارحین کی طبع بد گماں ادھر نہیں گئی۔ حالانکہ
 غالب نے مصری کے ترازے کو عشق عاشقی کے ضمن میں ایک دوسرے خط میں بھی
 استعمال کیا ہے۔“

فرمایا ”جا چھوڑ دیا حافظ دیوان سمجھ کر۔ لیکن حضرت، یہ روٹر کس زبان کا لفظ ہے؟
 کریمہ الصوت۔ بالکل گنوارو لگتا ہے۔ کیا راجستانی ہے؟“ عرض کیا ”خود ہمیں بھی یہی
 شبہ ہوا تھا۔ لہذا ہم نے ماجد بھائی سے پوچھا.....“
 ”کون ماجد بھائی؟“

”ماجد علی صاحب“ سابق سی ایس پی۔ لندن منتقل ہو گئے ہیں۔ چھوٹے بڑے اپنے بیگانے،
 باس اور ماتحت..... سب انہیں ماجد بھائی کہتے ہیں، سوائے ان کی بیگم زہرہ نگاہ کے۔

وہ انہیں ماجد پچا کہتی ہیں۔ ان سے رجوع کیا تو انہوں نے تصدیق کر دی کہ خلاف کی پرانی روٹی کو جسے غریب غرباء ہاتھوں سے قوم کے دوبارہ استعمال کرتے ہیں، روڑر کہتے ہیں۔

یوں تو وہ عاجز کے لیے پیر و مرشد کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا فرمایا ہوا ہمیشہ مستند ہی ہوتا ہے، تاہم میں نے مزید تشفی کے لیے پوچھا ”کیا بداؤں میں بھی بولا جاتا ہے؟“ چرے پر ایک بناؤٹی خشونت اور لہجے میں خفیف سی مصنوعی لکنت پیدا کرتے ہوئے، جو بحثا بحثی میں عصائے موسوی کا کام کرتی ہے، بولے ”دیکھئے! ذاتی بے تکلفی اپنی جگہ، علمی مباحث اپنی جگہ، بدایوں کو بداؤں کہنے کا حق صرف بدایوں والوں کو پہنچتا ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ کل کلاں کو آپ مجھے ماجد بھائی کی بجائے ماجد پچا کہنے لگیں تو لندن پولیس پولی گیمسی (تعدد ازدواج) میں دھر لے گی، آپ کا تو مزید کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہر کیف، روڑر صحیح ہے۔ بداؤں میں تو پھیری والے گھر گھر صدا لگا کے روڑر خریدتے تھے اور اس کے بدلے ریوٹیاں دیتے تھے جنہیں اندھے آپس میں بانٹ لیتے تھے۔“ علمی تحقیق و تدقیق سے خود فٹ بال کھیلنے کے مترادف تھا۔ ماجد بھائی کی بذلہ سنبجی کے سامنے اچھے اچھے نہیں ٹھہر پاتے۔ راوی غیبت بیاں کہتا ہے کہ ایک دفعہ ان کے باس (وزیر) کے دفتر کے سامنے کچھ دور پر لوگ عزت ماب کے خلاف ”ایوب خاں کا چچو! ایوب خاں کا چچو!“ کے نعرے لگا رہے تھے۔ وزیر موصوف نے ماجد بھائی سے پوچھا ”یہ لوگ کیوں شور مچا رہے ہیں؟“ انہوں نے جواب دیا۔ ”سر، کنٹری کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں۔“

جہیل صاحب اس طویل تشریح اور معتبر سند سے کچھ پیچھے۔ ناک سے سگریٹ کا دھواں خارج کرتے ہوئے بولے ”اگر آپ کو صاف روٹی سے الرجی ہے تو روڑر بھی چلے گا۔ لیکن ایک بات ہے۔ متروکات آپ کو بہت فیسی نیٹ کرتے ہیں۔ خیر، مجھے تو اچھے لگتے ہیں۔ کس واسطے کہ مجھے انٹیک جمع کرنے کا شوق ہے۔ لیکن ممکن ہے پڑھنے والوں کو اتنے اچھے نہ لگیں۔ بریکٹ میں معنی لکھ دیجئے گا۔“

عرض کیا ”مرزا اکثر طعنہ دیتے ہیں کہ تم ان معدودے چند لوگوں میں سے ہو جنہوں نے متروکہ جائیداد کا کوئی کلیم داخل نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ چلتے وقت تم اپنے ساتھ متروکات کا دفینہ کھود کر‘ سموچا ڈھو کر پاکستان لے آئے۔‘ تفسن بر طرف‘ اگر ان میں سے ایک لفظ جی ہاں‘ صرف ایک لفظ بھی دوبارہ رائج ہو گیا تو سمجھوں گا عمر بھر کی محنت سوارت ہوئی۔“

بولے ”پھر وہی“

افسوس! جمیل صاحب صرف دو ابواب دیکھ پائے تھے کہ ان کا بلاوا آ گیا۔ اب ایسا نکتہ داں‘ نکتہ سنج‘ نکتہ شناس کہاں سے لاؤں جس کا اعتراض بھی نکتہ پروری‘ استعداد آفرینی اور دل آسانی سے خالی نہ تھا۔

آخر میں اپنی شریک (سوانح) حیات ادیس فاطمہ کا شکریہ بھی لازم ہے کہ انہوں نے اپنے تبسم سقم شناس سے بہت سی خامیوں کی نشاندہی کی۔ تاہم بے شمار خن ہائے سوختنی اور غلطی ہائے مضامین بوجہ باقی رہ گئی ہوں گی۔ وہ سارا مسودہ دیکھ چکیں تو میں نے کہا۔ ”راجستانی لہجہ اور محاورہ کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بہت دھوتا ہوں پر چڑی کے رنگ چھنائے نہیں چھوڑتے۔“

Out, Damned spot! out, I say!

حیرت ہے‘ اس دفعہ تم نے زبان کی ایک بھی غلطی نہیں نکالی۔

کہنے لگیں۔ ”پڑھائی ختم ہوتے ہی علی گڑھ سے اس گھر‘ گڑھی میں آ گئی۔ تینتالیس برس ہو گئے۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں کہ میری زبان کیا تھی اور تمہاری بولی کیا۔ اب تو سنتی ہوں سبھی درست معلوم ہوتا ہے۔“

ایک دوسرے کی چھاپ‘ تلک سب چھین کر اپنا لینے اور دیائے سندھ اور راوی کا ٹھنڈا میٹھا پانی پینے کے بعد تو یہی کچھ ہوتا تھا۔ اور جو کچھ ہوا بہت خوب ہوا۔ فالحمد للہ رب العالمین۔

• حویلی

○ وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاجہ نہیں

یادش بخیر! میں نے ۱۹۴۵ء میں جب قبلہ کو پہلے پہل دیکھا تو ان کا حلیہ ایسا ہو گیا تھا جیسا اب میرا ہے۔ لیکن ذکر ہمارے یار طرح دار بشارت علی فاروقی کے خسر کا ہے، لہذا تعارف کچھ انہی کی زبانی سے اچھا معلوم ہو گا۔ ہم نے بارہا سنا، آپ بھی سنئے۔ ”وہ ہمیشہ سے میرے کچھ نہ کچھ لگتے تھے۔ جس زمانے میں میرے خسر نہیں بنے تھے تو پھوپھا ہوا کرتے تھے اور پھوپھا بننے سے پہلے میں انہیں پچھا حضور کہا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی یقیناً وہ کچھ اور لگتے ہوں گے، مگر اس وقت میں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہمارے ہاں مراد آباد اور کانپور کے رشتے ناٹے ابلی ہوئی سویوں کی طرح الجھے اور چچ در چچ گتھے ہوتے ہیں۔ ایسا جلالی، ایسا مغلوب الغضب آدمی زندگی میں نہیں دیکھا۔ بارے ان کا انتقال ہوا تو میری عمر آدمی ادھر، آدمی ادھر، چالیس کے لگ بھگ تو ہو گی۔ لیکن صاحب! جیسی دہشت ان کی آنکھیں دیکھ کر چھٹپن میں ہوتی تھی، ویسی ہی نہ صرف ان کے آخری دم تک رہی بلکہ میرے آخری دم تک بھی رہے گی۔ بڑی بڑی آنکھیں اپنے ساکٹ سے نکلی پڑتی تھیں۔ لال سرخ۔ ایسی ویسی؟ بالکل خون کبوتر لگتا تھا بڑی بڑی پتلیوں کے گرد لال ڈوروں سے ابھی خون کے فوارے چھوٹنے لگیں گے اور میرا منہ خونم خون ہو جائے گا۔ ہر وقت غصے میں بھرے رہتے تھے۔ جنہ کیوں؟ گالی ان کا تکیہ کلام تھی۔ اور جو رنگ تقریر کا تھا وہی تحریر کا۔ رکھ ہاتھ لکھتا ہے دھواں مغز قلم سے۔ ظاہر ہے کچھ ایسے لوگوں سے بھی پالا پڑتا تھا جنہیں بوجہ گالی نہیں دے سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر زبان سے تو کچھ نہ کہتے، لیکن چہرے پر ایسا

ایکسپریشن لاتے کہ قد آدم گلی نظر آتے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی کسی بھی رائے سے اختلاف کرتا۔ اختلاف تو درکنار اگر کوئی شخص محض ڈر کے مارے ان کی رائے سے اتفاق کر لیتا تو فوراً اپنی رائے تبدیل کر کے اُلٹے اس کے سر ہو جاتے۔ ارے صاحب! بات اور گفتگو تو بعد کی بات ہے۔ بعض اوقات محض سلام سے مشتعل ہو جاتے تھے۔ آپ کچھ بھی کہیں، کیسی ہی سچی اور سامنے کی بات کہیں، وہ اس کی تردید ضرور کریں گے۔ کسی کی رائے سے اتفاق کرنے میں اپنی سبکی سمجھتے تھے۔ ان کا ہر جملہ ”نہیں“ سے شروع ہوتا تھا۔ ایک دن کانپور میں کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ”آج بڑی سردی ہے“ بولے ”نہیں“ کل اس سے زیادہ پڑے گی۔“

”وہ چچا سے پھوپا بنے اور پھوپا سے خسر..... لیکن مجھے آخر وقت تک نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ نکاح کے وقت وہ قاضی کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ قاضی نے مجھ سے پوچھا، قبول ہے؟ ان کے سامنے منہ سے ہاں کہنے کی جرات نہ ہوئی۔ بس اپنی ٹھوڑی سے دو مودبانہ ٹھونکیں مار دیں جنہیں قاضی اور قبلہ نے رشتہ مناکحت کے لیے ناکافی سمجھا۔ قبلہ کڑک کر بولے۔ ”لوٹو“ بولتا کیوں نہیں؟“ ڈانٹ سے میں نروس ہو گیا۔ ابھی قاضی کا سوال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ میں نے ”جی ہاں قبول ہے“ کہہ دیا۔ آواز یکفخت اتنے زور سے نکلی کہ میں خود چونک پڑا۔ قاضی اچھل کر سرے میں گھس گیا۔ حاضرین کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ اب قبلہ اس پر بھنا رہے تھے کہ اتنے زور سے ”ہاں“ سے بیٹی والوں کی بیٹی ہوتی ہے۔ بس تمام عمر ان کا یہی حال رہا۔ اور تمام عمر میں کرب قرابت داری اور قربت قہری دونوں میں مبتلا رہا۔

حالانکہ اکلوتی بیٹی، بلکہ اکلوتی اولاد تھی۔ اور بیوی کو شادی کے بڑے ارمان تھے لیکن قبلہ نے مائیں کے دن عین اس وقت جب میرا رنگ نکھارنے کے لیے ایٹن ملا جا رہا تھا، کھلا بھیجا کہ دولہا میری موجودگی میں اپنا منہ سرے سے باہر نہیں نکالے گا۔ دو سو

قدم پہلے سواری سے اتر جائے گا اور پیدل چل کر عقد گاہ تک آئے گا۔ عقد گاہ انہوں نے اس طرح کہا جیسے اپنے فیض صاحب قتل گاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قبلہ کی دہشت دل میں ایسی بیٹھ گئی کہ مجھے تو عروسی چھپر کھٹ بھی پھانسی گھاٹ لگ رہا تھا۔ انہوں نے یہ شرط بھی لگائی کہ براتی پلاؤ، زرہ ٹھونسنے کے بعد یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ گوشت کم ڈالا اور شکر ڈیوڑھی نہیں پڑی۔ خوب سمجھ لو، میری حویلی کے سامنے بینڈ باجا ہرگز نہیں بجے گا اور تمہیں رنڈی نچوانی ہے تو body Over my dead اپنے کوٹھے پر نچاؤ۔

کسی زمانے میں راجپوتوں اور عربوں میں لڑکی کی پیدائش نحوست اور قہر الہی کی نشانی تصور کی جاتی تھی۔ ان کی غیرت یہ کیسے گوارہ کر سکتی تھی کہ ان کے گھر بارات چڑھے۔ داماد کے خوف سے وہ نوزائیدہ لڑکی کو زندہ گاڑ آتے تھے۔ قبلہ اس وحشیانہ رسم کے خلاف تھے۔ وہ داماد کو زندہ گاڑ دینے کے حق میں تھے۔

چہرے، چال اور تیور سے کوتوال شر لگتے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ بانس منڈی میں ان کی عمارتی لکڑی کی ایک معمولی سی دکان ہے۔ لکھا ہوا قد، چلتے تو قد، سینہ اور آنکھیں تینوں بیک وقت نکال کر چلتے تھے۔ ارے صاحب! کیا پوچھتے ہیں، اول تو ان کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور کبھی جی کڑا کر کے دیکھ بھی لیا تو بس لال بھبھوکا آنکھیں ہی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد۔ رنگ

گندمی، آپ جیسا، جسے آپ اس گندم جیسا بتاتے ہیں جسے کھاتے ہی حضرت آدم، بیک بیوی و دو گوش جنت سے نکال دیے گئے۔ جب دیکھو جھلاتے تنقالتے رہتے۔ مزاج، زبان اور ہاتھ کسی پر قابو نہ تھا۔ دائمی طیش سے لرنہ براندام رہنے کے سبب اینٹ، پتھر، لائچی، گولی، گالی کسی کا بھی نشانہ دائمی طیش نہیں لگتا تھا۔ کچھی کچھی مونچھیں جنہیں

گالی دینے سے پہلے اور بعد میں تاؤ دیتے۔ آخری زمانے میں بھوؤں کی بھی بل دینے لگے۔ گٹھا ہوا کسرتی بدن ململ کے کرتے سے جھلکتا تھا۔ چنی ہوئی آستین اور اس سے

بھی مہین چنی ہوئی دو پلی ٹوپی۔ گرمیوں میں خس کا عطر لگاتے۔ کیکری کی سلاہی کا چوڑی دار پاجامہ۔ چوڑیوں کی یہ کثرت کہ پاجامہ نظر نہیں آتا تھا۔ دھوبی الگنی پر نہیں سکھاتا تھا۔ علیحدہ بانس پر دستانے کی طرح چڑھا دیتا تھا۔ آپ رات کے دو بجے بھی دروازہ کھٹکھٹا کر بلائیں تو چوڑی دار ہی میں برآمد ہوں گے۔

واللہ! میں تو یہ تصور کرنے کی بھی جرات نہیں کر سکتا کہ دائی نے انہیں چوڑی دار کے بغیر دیکھا ہو گا۔ بھری بھری پنڈلیوں پر خوب کھبتا تھا۔ ہاتھ کے بنے ہوئے ریشمی ازار بند میں چابیوں کا گچھا چھنچھناتا رہتا۔ جو تالے برسوں پہلے بے کار ہو گئے تھے ان کی چابیاں بھی اس گچھے میں محفوظ تھیں۔ حد یہ کہ اس تالے کی بھی چابی تھی جو پانچ سال پہلے چوری ہو گیا تھا۔ محلے میں اس چور کا برسوں چرچا رہا، اس لیے چور صرف تالا، پہرہ دینے والا کتا اور ان کا شجرہ نسب چرا کر لے گیا تھا۔ فرماتے تھے کہ اتنی ذلیل چوری صرف کوئی عزیز رشتے دار ہی کر سکتا تھا۔ آخری زمانے میں یہ ازار بندی گچھا بہت وزنی ہو گیا تھا اور موقع بے موقع فلمی گیت کے بازو بند کی طرح کھل کھل جاتا۔ کبھی جھک کر گرم جوشی سے مصافحہ کرتے تو دوسرے ہاتھ سے ازار بند تھامتے۔ مئی جون میں نمبر پچ ۱۱۰ ہو جاتا اور منہ پر لو کے تھپڑے پڑنے لگتے تو پاجامے سے ائیر کنڈیشننگ کر لیتے۔ مطلب یہ تھا کہ چوڑیوں کو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں بھگو کر، سر پر انگوچھا ڈالے، تربوز کھاتے۔ خس خانہ و برقاب کہاں سے لاتے۔ اس کے محتاج بھی نہ تھے۔ کتنی ہی گرمی پڑے، دکان بند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے، میاں! یہ تو برنس پیٹ کا دھندا ہے۔ جب چمڑے کی جھونپڑی (پیٹ) میں آگ لگ رہی ہو تو کیا گرمی کیا سردی! لیکن ایسے میں کوئی شامت کا مارا گاہک آ نکلے تو برا بھلا کہہ کے بھگا دیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کھنچا کھنچا دوبارہ انہی کے پاس آتا تھا۔ اس لیے کہ جیسی عمدہ لکڑی وہ بیچتے تھے، ویسی سارے کانپور میں کہیں نہیں ملتی تھی۔ فرماتے تھے، داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بنی۔ لکڑی اور داغ دار؟ داغ تو دو ہی چیزوں پر جتا ہے،

دل اور جوانی۔

○ لفظ کے پچھن اور بازاری پان

تمباکو، قوام، خربوزے اور کڑھے ہوئے کرتے لکھنؤ سے، حقہ مراد آباد اور تالے علی گڑھ سے منگواتے تھے۔ حلوہ سونہن اور ڈپٹی نذیر احمد والے محاورے دلی سے۔ دانت گرنے کے بعد صرف محاوروں پر گزارہ تھا۔ گالیاں البتہ مقامی بلکہ خانہ ساز دیتے جن میں سلاست و روانی پائی جاتی تھی۔ طبع زاد لیکن بلاغت سے خالی۔ بس جغرافیہ سا کھینچ دیتے تھے۔ سلیم شاہی جوتیاں اور چڑی آپ کے جے پور سے منگواتے تھے۔ صاحب! آپ کا راجستان بھی خوب تھا۔ کیا کیا سوغاتیں گنوائی تھیں اس آپ نے؟ کھانڈ، سانڈ، بھانڈ، اور رانڈ۔ اور یہ بھی خوب رہی کہ مارواڑیوں کو جس چیز پر بھی پیار آتا اس کے نام میں ٹھہ ڈ اور لگا دیتے ہیں۔ مگر یہ بات آپ نے عجیب بتائی کہ راجستان میں رانڈ سے مراد خوبصورت ہوتی ہے۔ مارواڑی زبان میں سچ سچ کی بیوہ کے لیے بھی کوئی لفظ ہے کہ نہیں؟ یا سبھی خوبصورت ”نور علی نور“ بلکہ ”حور علی حور“ ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ سو سو سال قبل تک رنڈی سے بھی مراد صرف عورت ہوتی تھی۔ جب سے مردوں کی نیتیں خراب ہوئیں اس لفظ کے پچھن بھی بگڑ گئے۔ صاحب! راجستان کے تین طرفہ تحفوں کے تو ہم بھی قائل اور گھائل ہیں۔ میرا بائی، مہدی حسن اور ریشمال۔

ہاں، تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ باہر نکلتے تو ہاتھ میں پان کی ڈبیا اور بٹوہ رتتا۔ بازار کا پان ہرگز نہیں کھاتے تھے۔ بازاری پان صرف رنڈوے، تماش بین اور بمبئی والے کھاتے ہیں۔ صاحب، یہ نفاست اور پرہیز میں نے انہی سے سیکھا۔ ڈبیا چاندی کی، نقشین، بھاری، ٹھوس۔ اس میں جگہ جگہ ڈینٹ نظر آتے تھے جو انسانی سروں سے تصادم کے باعث پڑے تھے۔ طیش میں اکثر پانوں بھری ڈبیا پھینک مارتے۔ بڑی دیر تک یہ پتہ ہی نہیں

چلتا تھا کہ مضروب کے سر اور چہرے سے خون نکل رہا ہے یا بکھرے پانوں کی لالی نے غلط جگہ رنگ جمایا ہے۔ بڑے خاص طور سے آپ کی جائے پیدائش، ریاست ٹونک سے منگواتے تھے۔ کہتے تھے کہ وہاں کے پٹوے ایسے ڈورے ڈالتے ہیں کہ ایک ذرا گھنڈی کو جھوٹوں ہاتھ لگا دو تو بٹہ آپ مصاحبوں کی باچھوں کی طرح کھٹا چلا جاتا ہے۔ گنگا بھوپال سے آتا تھا۔ لیکن خود نہیں کھاتے تھے۔ فرماتے تھے 'میٹھا پان' ٹھہری 'گنگا اور ناول۔ یہ سب نابالغوں کے شغل ہیں۔ شاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

ردیف قافیہ سے آزاد شاعری سے بطور خاص چڑتے تھے۔ یوں بھی 'بقول شخصے' آزاد شاعری کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر نیٹ کے ٹینس کھیلنا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ اردو فارسی کے جتنے بھی اشعار لکڑی، آگ، دھوکے، ہیکڑی، لڑ مرنے، ناکامی اور خواری سے متعلق ہیں سب یاد کر رکھے تھے۔ صورت حال کبھی قابو سے باہر ہو جاتی تو شعر سے اس کا دفعیہ فرماتے۔ آخری زمانے میں عزت گزیر اور مردم بیزار ہو گئے تھے اور صرف دشمنوں کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے باہر نکلتے تھے۔ خود کو کاسنی اور بیوی کو موتیا رنگ پسند تھا۔ شیروانی ہمیشہ موتیا رنگ کے ٹسر کی پٹنی۔

○ واہ کیا باتے کوئے برتن کی!

بشارت کی زبانی تعارف ختم ہوا۔ اب کچھ میری کچھ ان کی زبانی سنئے اور رہی سہی زبان خلق سے، جسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔

کانپور سے پہلے بانس منڈی اور پھر کوپر گنج میں قبلہ کی عمارتی لکڑی کی دکان تھی۔ اس کو آپ ان کا حیلہ معاش اور وسیلہ مردم آزاری کہہ سکتے ہیں۔ تھوڑی بہت جلانے کی لکڑی بھی رکھتے تھے مگر اسے کبھی لکڑی نہیں کہا۔ سوختہ یا ہیزم سوختنی کہتے تھے۔

ان کی دکان کو کبھی کوئی نا آشنائے مزاج ٹال کہہ دیتا تو دوسیری لے کر دوڑتے۔ جوانی میں پنسیری لے کر دوڑتے تھے۔ تمام عمر پتھر کے باٹ استعمال کئے۔ فرماتے تھے 'لوہے

کے فرنگی باٹ بھاری اور بے برکت ہوتے ہیں۔ پتھر کے باٹ کو تو بازوؤں میں بھر کے، سینے سے لگا کے اٹھانا پڑتا ہے۔ اعمال تو دور رہے، کبھی کسی کو یہ جرات نہ ہوئی کہ ان کے پتھر کے بانوں ہی کو تلو کر دیکھ لے۔ کس کی شامت آئی تھی کہ ان کی دی ہوئی رقم یا لوٹائی ہوئی ریزگاری کو گن کر دیکھے۔ اس زمانے میں یعنی اس صدی کی تیسری دہائی میں عمارتی لکڑی کی کھپت بہت کم تھی۔ ”سال“ اور چیر کا رواج عام تھا۔ بہت ہوا تو چوکھٹ اور دروازے شیشم کے بنوا لیے۔ ساگوان تو صرف امراء رؤسا کی ڈانگ نیمبل اور گوروں کے تابوت میں استعمال ہوتی تھی۔ فرنیچر ہوتا ہی کہاں تھا۔ بھلے گھروں میں فرنیچر کے ذیل میں صرف چاپاکی آتی تھی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، ان دنوں کرسی صرف دو موقعوں پر نکالی جاتی تھی۔ اول، جب حکیم، دید، ہو میو پیٹھ، پیر فقیر اور سیانوں سے مایوس ہو کر ڈاکٹر کو گھر بلایا جائے۔ اس پر بیٹھ کر وہ جگہ جگہ اسٹیٹھوسکوپ لگا کر دیکھتا کہ مریض اور موت کے درمیان جو خلیج حائل تھی اسے ان حضرات نے اپنی داؤں اور تعویذ گنڈوں سے کس حد تک پر کیا ہے۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جس گھر میں موسمی یا ممین لکڑی کی پٹاری میں روئی میں رکھے ہوئے پانچ انگور آئیں یا سولاہیٹ پہنے ڈاکٹر آئے (اور اس کے آگے آگے ہٹو بچو کرتا ہوا تیار دار خصوصی اس کا چمڑے کا بیگ اٹھائے) تو اڑوس پڑوس والے جلدی جلدی کھانا کھا کر خود کو تعزیت اور کندھا دینے کے لیے تیار کر لیتے تھے۔ در حقیقت ڈاکٹر کو صرف اس مرحلے پر بلا کر اس کرسی پر بٹھایا جاتا تھا جب وہ صورت حال پیدا ہو جائے جس میں دو ہزار سال پہلے لوگ حضرت عیسیٰ کو آزماتے تھے۔ کرسی کے استعمال کا دوسرا اور آخری موقع ہمارے یہاں تختوں پر آتا تھا جب لڑکے کو دولہا کی طرح سجا بنا اور مٹی کا کھلوٹا ہاتھ میں دے کر اس کرسی پر بٹھا دیا جاتا تھا۔ اس جلاوی کرسی کو دیکھ کر اچھے اچھوں کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ غریبوں میں اس مقصد کے لیے نئے مات یا لمبی وضع کے کورے مٹکے کو الٹا کر سرخ کپڑا ڈال دیتے تھے۔

○ چارپائی

سچ تو یہ ہے کہ جہاں چارپائی ہو وہاں کسی فرنیچر کی ضرورت نہ گنجائش نہ تک۔ انگلستان کا موسم اگر اتنا ذلیل نہ ہوتا اور انگریزوں نے بروقت چارپائی ایجاد کر لی ہوتی تو نہ صرف یہ کہ وہ موجودہ فرنیچر کی کھکھیڑ سے بچ جاتے بلکہ پھر آرام وہ چارپائی چھوڑ کر کالونیز بنانے کی خاطر گھر سے باہر نکلنے کو بھی ان کا دل نہ چاہتا۔ ”اور کولڈ“ سورج بھی ان کی سلطنت پر ایک صدی تک ہمہ وقت چمکتے رہنے کی ڈیوٹی سے بچ جاتا۔ اور کم از کم آج کل کے حالات میں اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہنے کے لیے ان کے گھر میں کوئی ڈھنگ کی چیز تو ہوتی۔ ہم نے ایک دن پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے بی ٹی سے کہا کہ بقول آپ کے انگریز تمام ایجادات کے موجد ہیں۔ آسائش پسند بے حد پریکٹیکل لوگ ہیں۔ حیرت ہے چارپائی استعمال نہیں کرتے۔ بولے ”ادوائن کسے سے جان چراتے ہیں۔ راقم الحروف کے خیال میں ایک بنیادی فرق ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے وہ یہ کہ یورپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے جبکہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹ نہ سکیں۔ مثال میں دری، گدیے، قالین، جازم، چاندنی، چارپائی، کوچہ یار اور پلوئے دلدار کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک چیز ہمارے ہاں البتہ ایسی تھی جسے صرف بیٹھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے حکمرانوں کا تخت کہتے تھے۔ لیکن جب انہیں اسی پر لٹکا کر اور پھر لٹا کر منہ دیا جاتا تو وہ یہ تختہ کھلاتا تھا اور اس عمل کو تختہ الٹنا کہتے تھے۔

○ اسٹیشن، لکڑی منڈی اور بازار حسن میں بجوگ

مقصد اس تمہید غیر دل پذیر کا یہ کہ جہاں چارپائی کا چلن ہو وہاں فرنیچر کی بزنس پنپ

نہیں سکتی۔ اب اسے چوب عمارتی کہئے یا ہیزم غیر سوختنی، دھندا اس کا بھی ہمیشہ مندا ہی رہتا تھا کہ دکانوں کی تعداد گاہکوں سے زیادہ تھی۔ لہذا کوئی شخص ایسا نظر آ جائے جو طئے اور چال ڈھال سے ذرا بھی گاہک معلوم ہو تو ٹکڑ منڈی کے دکاندار اس پر ٹوٹ پڑتے۔ بیشتر گاہک گرد و نواح کے دیہاتی ہوتے جو زندگی میں پہلی اور آخری بار لکڑی خریدنے کانپور آتے تھے۔ ان بچاروں کا لکڑی سے دو ہی مرتبہ سابقہ پڑتا تھا۔ ایک اپنا گھر بناتے وقت دوسرے اپنا کیا کرم کرواتے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے جن پڑھنے والوں نے دلی یا لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا نقشہ دیکھا ہے وہ اس چھینا جھپٹی کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں ہم نے دیکھا کہ دلی سے لاہور آنے والی ٹرین کے رکتے ہی جیسے ہی مسافر نے اپنے جسم کا کوئی حصہ دروازے یا کھڑکی سے باہر نکالا، قلی نے اسی کو مضبوطی سے پکڑ کے سالم مسافر کو ہتھیلی پر رکھا اور ہوا میں ادھر اٹھا لیا۔ اور اٹھا کر پلیٹ فارم پر کسی صراحی یا حقے کی چلم پر بٹھا دیا۔ لیکن جو مسافر دوسرے مسافروں کے دھکے سے خود بخود ڈبے سے باہر نکل پڑے، ان کا حشر ویسا ہی ہوا جیسا اردو کی کسی نئی نویلی کتاب کا نقادوں کے ہاتھ ہوتا ہے۔ جو چیز جتنی جس کے ہاتھ لگی، سر پر رکھ کر ہوا ہو گیا۔ دوسرے مرحلے مسافر پر ہوٹلوں کے دلال اور ایجنٹ ٹوٹ پڑتے۔ سفید ڈرل کا کوٹ پتلون، سفید قمیص، سفید رومال، سفید کینوس کے جوتے، سفید موزے، سفید دانت۔ اس کے باوجود محمد حسین آزاد کے الفاظ میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ ان کی ہر چیز سفید اور اجلی ہوتی، سوائے چرے کے۔ ہنستے تو معلوم ہوتا تو ہنس رہا ہے۔ یہ مسافر پر اس طرح گرے جیسے انگلستان میں رگی کی گنبد اور ایک دوسرے پر کھلاڑی گرتے ہیں۔ ان کی ساری تنگ و دو کا مقصد خود کچھ حاصل کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو حاصل کرنے سے باز رکھنا ہوتا تھا۔ مسلمان دلال ترکی ٹوپی سے پہچانے جاتے۔ وہ دلی اور یوپی کے آنے والے مسلمان مسافروں کو ٹوٹی دار لوٹے، مستورات، کثرت اطفال اور قیے پرائٹھے کے بھبھکے سے فوراً پہچان لیتے اور ”السلام علیکم“ ”Brother in Islam“ کہہ کر لپٹ جاتے۔ مسلمان مسافروں کے ساتھ صرف مسلمان

دلال ہی دھینگا مشتی کر سکتے تھے۔ جس دلال کا ہاتھ مسافر کے کپڑوں کے مضبوط ترین حصے پر پڑتا وہی اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آتا۔ جن کا ہاتھ لباس کے کمزور یا بوسیدہ حصوں پر پڑتا، وہ بعد میں ان کو بطور دستی رومال استعمال کرتے۔ نیم ملبوس مسافر قدم قدم پر اپنی ستر کشائی کرواتا، اسٹیشن کے باہر قدم رکھتا تو لا تعداد پہلوان جنہوں نے اکھاڑے کو ناکافی محسوس کر کے ٹانگہ چلانے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا خود اس کو چھوڑ دیتے۔ اگر مسافر کے تن پر کوئی چھتھرا اتفاقاً بیچ رہا تو اسے بھی نوچ کر ٹانگے کی پچھلی سیٹ پر رام چندر جی کی کھڑاؤں کی طرح سجا دیتے۔ اگر کسی کے چوڑی دار کے کمر بند کا سرا ٹانگے والے ہاتھ لگ جاتا تو وہ غریب گھر پہ ہاتھ رکھے اسی میں بندھا چلا آتا۔ کوئی مسافر کا دامن آگے سے کھینچتا کوئی پیچھے سے زلیخائی کرتا۔ آخری راؤنڈ میں ایک ٹکڑا سا ٹانگے والا سواری کا دایاں ہاتھ اور دوسرا مسٹرا اس کا بایاں ہاتھ پکڑ کر war of tug of کھیلنے لگتے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہر دو فریقین اپنے اپنے حصے کی ران اور دست اکھیز کر لے جائیں، ایک تیسرا پھریتلا ٹانگے والا ٹانگوں کے چرے ہوئے چمنے کے نیچے بیٹھ کر مسافر کو یکفخت اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا اور ٹانگے میں جوت کر ہوا ہو جاتا۔

کم و بیش یہی نقشہ کو پرجن کی لکڑ منڈی کا ہوا کرتا تھا، جس کے قلب میں قبلہ کی دکان تھی۔ گودام بالعموم دکان سے ملحق، عقب میں ہوتے تھے۔ گاہک پکڑنے کے لیے قبلہ اور دو تین چڑی مار دکانداروں نے یہ کیا کہ دکانوں کے باہر سڑک پر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کیبن بنا لیے۔ قبلہ کا کیبن منہ، ٹکٹے، حقے، اگلدان اور اسپرنگ سے کھلنے والے چاقو سے آراستہ تھا۔ کیبن گویا ایک نوع کا مچان تھا جہاں سے گاہک کو مار کراتے تھے۔ پھر اسے چکار پچکار کر اندر لے جایا جاتا جہاں کوشش یہ ہوتی تھی کہ خالی ہاتھ اور بھری جیب واپس نہ جانے پائے۔ جیسے ہی کوئی شخص جو قیافے سے گاہک لگتا، سامنے سے گزرتا تو دور و نزدیک کے دکاندار اسے ہاتھ کے اشارے سے یا آواز دے کر بلاتے ”مہاراج! مہاراج!“ ان مہاراجوں کو دوسرے دکانداروں کے پیچھے سے

چھڑانے اور خود گھیٹ کر اپنے کچھار میں لے جانے کے دوران اکثر ان کی پگڑیاں کھل کر پیروں میں الجھ جاتیں۔ اس سلسلے میں آپس میں اتنے جھگڑے اور ہاتھ پائی ہو چکی تھی کہ منڈی کے تمام بیوپاریوں نے پنچایتی فیصلہ کیا کہ گاہک کو صرف دکاندار آواز دے کر بلائے گا جس کی دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا ہو۔ لیکن جیسے ہی وہ کسی دوسرے دکاندار کے حلقہ تشدد میں داخل ہو گا تو اسے کوئی اور دکاندار ہرگز آواز نہ دے گا۔ اس کے باوجود چھینا جھپی اور کسٹم بچھاڑ بڑھتی ہی گئی تو ہر دکان کے آگے چوٹے سے حد بندی کی لائن کھینچ دی گئی۔ اس سے یہ فرق پڑا کہ کشتی بند ہو گئی۔ کبڈی ہونے لگی۔ بعض دکانداروں نے مار پیٹ، گاہکوں کو ہانکا کرنے اور انہیں ڈنڈا ڈول کر کے اندر لانے کے لیے بگڑے پہلوان اور شر کے چھٹے ہوئے شوہرے اور مشنڈے پارٹ ٹائم ملازم رکھ لیے تھے۔ کساد بازاری اپنی انتہا کو پہنچ ہوئی تھی۔ یہ لوگ دن میں لکڑ منڈی میں گاہکوں کو ڈرا دھمکا کر ناقص اور کنڈم مال خریدواتے اور رات کو یہی فریضہ بازار حسن میں انجام دیتے۔ بہت سی طوائفوں نے اپنی آبرو کو ہر شب سے زیادہ غیر محفوظ رکھنے کی غرض سے ان کو بطور ”پمپ“ ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ قبلہ نے اس قسم کا کوئی غنڈا یا بد کردار پہلوان ملازم نہیں رکھا کہ انہیں زور بازو پر پورا بھروسہ تھا۔ لیکن اوروں کی طرح مال کی چرائی کٹائی میں مار کٹائی کا خرچہ بھی شامل کر لیتے تھے۔

○ آلا سے اخراج خون : جونکے، سیٹگی، لائٹھی

ہمہ وقت طیش کا عالم طاری رہتا تھا۔ سونے سے پہلے ایسا موڈ بنا کر لیٹتے کہ آنکھ کھلتے ہی غصہ کرنے میں آسانی ہو۔ پیشانی کے تین بل سوتے میں بھی نہیں مٹتے تھے۔ غصے کی سب سے خالص قسم وہ ہوتی ہے جو کسی اشتعال کی محتاج نہ ہو یا کسی بہت ہی

معمولی سی بات پر آ جائے۔ غصے کے آخر ہوتے ہوتے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ آیا کس بات پر تھا۔ بیوی ان کو رونہ نہیں رکھنے دیتی تھی۔ غالباً ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔ ایک دن عشاء کی نماز کے بعد گزرگرا گزرگرا کر اپنی دیرینہ پریشانیاں دور ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ ایک تانہ پریشانی کا خیال آتے ہی ایک دم جلال آ گیا۔ دعا ہی میں کہنے لگے کہ تو نے میرے پرانی پریشانیاں ہی کون سی رفع کر دیں جو اب یہ نئی پریشانی دور کرے گا۔ اس رات مصلہ تہہ کرنے کے بعد پھر کبھی نماز نہیں پڑھی۔

ان کے غصے پر یاد آیا کہ اس زمانے میں کن میلنے محلوں بازاروں میں پھیری لگاتے تھے۔ کان کا میل نکالنے پر ہی کیا موقوف، دنیا جہنم کے کام گھر بیٹھے ہو جاتے تھے۔ سبزی، گوشت اور سودا سلف کی خریداری، حجامت، تعلیم، زچگی، پیڑھی، کھاٹ کھولے کی یہاں تک کہ خود اپنی مرمت بھی، سب گھر بیٹھے ہو جاتی۔ بیسیوں کے ناخن نہرنی سے کاٹنے اور پیٹھ ملنے کے لیے نائیں گھر آتی تھیں۔ کپڑے بھی مغلانیاں گھر آ کر سیتی تھیں تا کہ نامحرموں کو ناپ تک کی ہوا نہ لگے۔ حالانکہ اس زمانے کے زنانہ پوشاک کے جو نمونے ہمارے نظر سے گزرے ہیں وہ ایسے ہوتے تھے کہ کسی بھی لیٹر بکس کا ناپ لے کر بیٹے جاسکتے تھے۔ غرض کہ سب کام گھر ہی میں ہو جاتے۔ حد یہ کہ موت تک گھر میں واقع ہوتی تھی اس کے لیے باہر جا کر کسی ٹرک سے اپنی روح قبض کروانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ فساد خون سے کسی کے بار بار پھوڑے پھنسی نکلیں یا دماغ میں خیالات فاسدہ کا ہجوم دن دہاڑے بھی رہنے لگے تو گھر پر ہی فصد کھول دی جاتی تھی۔ فاضل و فاسد خون نکلوانے کی غرض سے اپنا سر پھڑوانے یا پھوڑنے کے لیے کسی سیاسی جلسے میں جانے یا حکومت کے خلاف مظاہرہ کر کے لاشی کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس زمانے میں لاشی کو آلہ اخراج خون کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ چونکہ اور لگانے والی کنجریاں روز پھیری لگاتی تھیں۔ اگر اس زمانے کے کسی حکیم کا ہاتھ آج کل کے نوجوانوں کی نبض پر پڑ جائے تو کوئی

نوجوان ایسا نہ بچے جس کے جہل تھاں سیٹگی لگی نظر نہ آئے۔ رہے ہم جیسے آج کل کے بزرگ کہ

کی جس سے بات اس کو ہدایت ضرور کی
تو کوئی بزرگ ایسا نہ بچے گا جس کی زبان پر حکیم صاحبان
جو تک نہ لکوا دیں۔

ہم واقعہ یہ بیان کرنے چلے تھے کہ گرمیوں کے دن تھے۔
قبلہ اولے کا قورمہ اور خربوزہ تناول فرما کر کیبن میں قیلولہ
کر رہے تھے کہ اچانک کن میلنے نے کیبن کے دروازے
پر بڑے زور سے آواز لگائی ”کان کا میل“ خدا جانے میٹھی
نیند سو رہے تھے یا کوئی بہت ہی حسین خواب دیکھ رہے
تھے جس میں گاہک ان سے تجنے داموں دھڑا دھڑ لکڑی خرید
رہے تھے، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ایک دفعہ تو دہل گئے۔ جتن
کے پاس پڑی ہوئی لکڑی اٹھا کر اس کے پیچھے ہو لیے۔
کینے کی یہ جرات کہ ان کے کان سے فقط ایک گز دور
بلکہ پاس ایسے گستاخانہ طریقے سے چیخے۔ یہ کہنا تو درست
نہ ہو گا کہ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے یہ۔ اس لیے
کہ قبلہ غصے میں ایسے بھرے ہوئے تھے کہ کبھی کبھی اس
سے آگے بھی نکل جاتے۔ سڑک پر کچھ دور بھاگنے کے
بعد کن میلیا گلیوں میں نکل گیا اور آنکھوں سے اوجھل ہو
گیا۔ مگر قبلہ محض اپنی چھٹی حس کی بتائی ہوئی سمت میں
دوڑتے رہے اور یہ وہ سمت تھی جس طرف کوئی شخص
جس کے پانچوں حواس سلامت ہوں، جارحانہ انداز میں لکڑی
لاٹھی گھماتا ہرگز نہ جاتا کہ یہ تھانے کی طرف جاتی تھی۔

اس وحیانہ دوڑ میں قبلہ کی لکڑی اور کن میلنے کا پکڑ جس کے ہر پیچ میں اس نے میل نکالنے کے اوزار اڑس رکھے تھے، زمین پر گر گئی۔ اس میں سے ایک ڈبیا بھی نکلی جس میں اس نے کان کا میل جمع کر رکھا تھا۔ نظر پچا کر اسی میں سے تولہ بھر میل نکال کر دکھا دیتا کہ دیکھو یہ تمہارے کان سے نکلا ہے۔ کسی کے کان سے گولہ کے بھنگے برآمد کر کے کہتا کہ تمہارے کان میں جو بھن بھن تن تن کی آوازیں آ رہی تھیں وہ انہیں کی تھیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ کان کی بھول بھلیوں میں اتنی دور تک سچ سچ سلامتی ڈالتا چلا جاتا کہ محسوس ہوتا ابھی کان کے راستے آنتیں بھی نکال کر ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ قبلہ نے اس پکڑ کو چڑھا کر بلی اپنی کیبن کے سامنے اس طرح گاڑ دی جس طرح اگلے وقتوں میں کوئی بے صبرا ولی عہد، یا وہ نہ ہو تو پھر کوئی دشمن، بادشاہ سلامت کا سر کاٹ کر نیزے پر ہر خاص و عام کی اطلاع کے لیے بلند کر دیتا تھا۔ اس کی دہشت ایسی بیٹھی کہ دکان کے سامنے سے بڑھتی، کھٹ بنے، سیگی لگانے والیوں اور سحری کے لیے جگانے والوں نے بھی لکنا چھوڑ دیا۔ ملحقہ مسجد کا کرمہ الصوت موذن بھی عقب والی گلی سے آنے جانے لگا۔

○ گانسی کی لٹیا، بالی عمریا اور چگی داڑھی

قبلہ اپنا مال بڑی توجہ، محنت اور محبت سے دکھاتے تھے۔ ”محبت“ کا اضافہ ہم نے اس لیے کیا کہ وہ گاہک کو تو شیر کی نظر سے دیکھتے، مگر اپنی لکڑی پر محبت سے ہاتھ پھیرتے رہتے۔ کوئی ساگوان کا تختہ ایسا نہیں تھا جس کے ریشوں کے ابر اور رگوں (Veins) کا طفری، اگر وہ چاہیں تو یادداشت سے کھنڈ پر نہ بنا سکتے ہوں۔ لکڑی منڈی میں وہ واحد دکاندار تھے جو گاہک کو اپنا اور ہر شہتیر اور بلی کا شجرہ نسب ازبر کرا دیتے تھے۔ ان کا اپنا شجرہ نسب بلی سے بھی زیادہ لمبا تھا۔ اس پر اپنے جد اعلیٰ کو ٹانگ رکھا تھا۔ ایک بلی کی قامت زبا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے، سوا انتالیس فٹ لمبی ہے،

گوئدہ کی ہے۔ افسوس! اصغر گوئدوی کے غوغائے شاعری نے گوئدہ کی بلیوں کی شہرت کا بیڑا غرق کر دیا۔ لاکھ کہو! اب کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ گوئدے کی اصل وجہ شہرت خوبصورت بلیاں تھیں۔ اصغر گوئدوی سے پہلے ایسی سیدھی، بے گانٹھ بلی ملتی تھی کہ چالیس فٹ اونچے سرے پر سے چھلا چھوڑو تو بے روک، سیدھے نیچے جھن سے آ کے ٹھہرتا تھا۔ ان کے ہاں کا ہر شہتیر اصیل اور خاندانی تھا۔ بیشتر تو خالص مغل یا روہیل کھنڈ کے پٹھان معلوم ہوتے تھے کہ ہر آئے گئے کے کپڑے پھاڑتے اور خود

مشکل سے چرتے تھے۔ کبھی قبلہ کونے میں پڑے ہوئے گرم و سرد و سیلاب چشیدہ Seasoned

تختے کی طرف اتنے ادب و احترام سے اشارہ کرتے گویا ابھی ابھی جوئی پہاڑ کی ترائی سے کشتی نوح میں سے اکھاڑ کر بطور خاص ایک ”دانہ“ آپ کے Approval کے لیے لے آئے ہیں۔ کبھی میری ساگوان کے لٹھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے، میاں! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، بچہ ہے۔ بہت سے بہت ۸۰ سال۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سو سال کا ساگوان ارادوی کے جنگلوں میں آندھی طوفان میں بالکل کھڑی کمر استادہ رہتا ہے۔ لیکن صاحب! ہے بلا کا سیزنڈ۔ سینکڑوں بارشوں اور سات دیاؤں کا پانی پی کے یہاں پہنچا ہے۔ اور اس لٹھے پر تو مگر مجھ نے پیشاب بھی کیا ہے۔ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) یہ جو کنول نین گرہ نظر آ رہی ہے، اس پر۔ مگر مجھ جس لکڑی پر موت دے اس کو حشر تک نہ دیمک لگ سکتی ہے نہ آگ۔ اس پر خواجہ عبدالحمید جو منشیانہ ڈیمک کے لیے لکڑی خریدنے آئے تھے، پوچھ بیٹھے ”کیا مگر مجھ بجلی کے کبے کی بجائے درخت پر.....“ وہ جملہ مکمل نہ کر پائے تھے کہ قبلہ تنک کر بولے۔ ”جی نہیں“ مگر مجھ تو سبیل اہل اسلام میں زنجیر سے بندھے ہوئے ٹین کے گلاس سے پانی پی کے سڑک پر ٹل ٹل کے استنجا سکھاتے ہیں، آپ کے والد ماجد کی طرح۔ آیا خیال شریف میں؟“

بس چوبیس گھنٹے مزاج کی کچھ ایسی ہی جوالا مکھی کیفیت رہتی تھی۔ ایک دفعہ حاجی محمد

اسحاق چمڑے والے کچھ شیشم خریدنے آئے۔ قبلہ یوں تو ہر لکڑی کی تعریف میں نہیں آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے، لیکن شیشم پر سچ سچ فریفتہ تھے۔ اکثر فرماتے ”تخت طاؤس میں شاہ جہاں نے شیشم ہی لگوائی تھی۔ شیشم کے گن گاہک اور قدر دان تو قبر میں جا سوئے۔ مگر کیا بات ہے شیشم کی! جتنا استعمال کرو اتنے ہی جوہر کھلتے ہیں۔ شیشم کی جس چارپائی پر میں پیدا ہوا، اسی پر دادا میاں کی ولادت ہوئی تھی۔“ اپنے حسن تولد و توارد کو قبلہ چارپائی اور دادا جان دونوں کے لیے باعث سعادت اور افتخار سمجھتے تھے۔“ حاجی محمد اسحاق بولے۔ ”یہ لکڑی تو صاف معلوم نہیں ہوتی۔“ قبلہ نہ جانے کتنے برسوں بعد مسکرائے۔ حاجی صاحب کی داڑھی کو ٹنگی باندھ کر دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ ”یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی، کانسی کی لٹیا، بالی عمریا اور چگی داڑھی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیرواتی ہی چمکتی ہے۔ اعلیٰ ذات کی شیشم کی پہچان یہ ہے کہ آرا، رندہ، برما سب کھنڈے (کنڈ) اور ہاتھ شل ہو جائیں۔ یہ چیز تھوڑا ہی ہے کہ ایک ذرا کیل ٹھونکو تو الف سے لے کر یے تک چر جائے۔ پر ایک بات ہے۔ تانہ کئی ہوئی چیز سے بن مہکار کی ایک آبشار پھوٹ پڑتا ہے۔ لگتا ہے، اس میں نہایا جا رہا ہوں۔ جس دن کارخانے میں چیز کی کٹائی ہونے والی ہو اس دن میں عطر لگا کر نہیں آتا۔“ قبلہ کا موڈ بدلا تو حاجی محمد اسحاق کی ہمت بندھی۔ کہنے لگے، یہ شیشم تو واقعی اعلیٰ درجہ کی معلوم ہوتی ہے مگر سیزنڈ نہیں لگتی۔ قبلہ کے آگ ہی تو لگ گئی۔ فرمایا ”سیزنڈ..... کتنے فاقوں میں سیکھا ہے، یہ لفظ اگر فقط سیزنڈ ہی چاہیے تو سب سے زیادہ سیزنڈ سامنے والی مسجد کے غسل میت کا تختہ ہے۔ بڑا پانی پیا ہے اس نے۔ لاؤں؟..... اسی پہ لٹا دوں گا۔“

○ سائی کے ساتھ عزت سادات بھی گئی

یوں تو ان کی زندگی ڈیل کارننگی کے ہر اصول کی اول تا آخر نہایت کامیاب خلاف ورزی تھی، لیکن بزنس میں انہوں نے اپنے ہتھکنڈے الگ ایجاد کئے تھے۔ گاہک سے جب تک یہ نہ کھلوا لیں کہ لکڑی پسند ہے، اس کی قیمت اشارتاً بھی نہیں بتاتے تھے۔ وہ پوچھتا بھی تو صاف ٹال جاتے۔ ”آپ بھی کمال کرتے ہیں“ آپ کو لکڑی پسند ہے۔ لے جائیے، گھر کی بات ہے۔“ گاہک جب قطعی طور پر لکڑی پسند کر لیتا تو قبلہ قیمت بتائے بغیر ہاتھ پھیلا کر بیعانہ طلب کرتے۔ سستا ملتا تھا۔ وہ دونی یا چونی کی سائی پیش کرتا جو اس سودے کے لیے کافی ہوتی۔ اشارے سے دھتکارے ہوئے کہتے، چاندی دکھاؤ (یعنی کم از کم ایک کلدار روپیہ نکالو) وہ بیچارہ شرما حضوری ایک روپیہ نکالتا جو اس زمانے میں پندرہ سیر گیہوں یا سیر بھر اصلی گھی کے برابر ہوتا تھا۔ قبلہ روپیہ لے کر اپنی ہتھیلی پر اس طرح رکھے رہتے کہ اسے تسلی کے لیے نظر تو آتا رہے، مگر جھپٹنا نہ مار سکے۔ ہتھیلی کو اپنے نیاہ قریب بھی نہ لاتے مبادا سودا پٹنے سے پہلے ہی گاہک بدک جائے۔

کچھ دیر بعد خود بخود کہتے، مبارک ہو سودا پکا ہو گیلہ پھر قیمت بتاتے جسے سن کر وہ ہکا بکا رہ جاتا۔ وہ قیمت پر حجت کرتا تو کہتے، عجیب گھن چکر ہو، سائی دے کر پھرتے ہو۔ ابھی روپیہ دے کے سودا پکا کیا ہے۔ ابھی تو اس میں سے تمہارے ہاتھ کی گرمائی بھی نہیں گئی اور ابھی پھر گئے۔ اچھا کہہ دو کہ یہ روپیہ تمہارا نہیں ہے۔ کہو کہو۔

قیمت ناپ تول کر ایسی بتاتے کہ کائیاں سے کائیاں گاہک بدھا میں پڑ جائے اور یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ پیشگی ڈوبنے میں کتنا نقصان ہے یا اس کے بھاؤ لکڑی خریدنے میں۔

دوران حجت کتنی ہی گرما گرمی بلکہ ہاتھ پائی ہو جائے وہ اپنی ہتھیلی کو چت ہی رکھتے۔ مٹھی کبھی بند نہی کرتے تھے تا کہ بے آبرو ہوتے ہوئے گاہک کو اطمینان رہے کہ کم از کم سائی تو محفوظ ہے۔ ان کے بارے میں ایک قصہ مشہور تھا کہ ایک سر پھرے گاہک سے جھگڑا ہوا تو دھوبی پاٹ کا داؤ لگا کر زمین پر دے مارا اور چھاتی پر چڑھ کے بیٹھ گئے۔ لیکن اس پوز میں بھی اپنی ہتھیلی جس پر روپیہ رکھا تھا، چت ہی رکھی تا کہ

اسے یہ بدگمانی نہ ہو کہ روپیہ ہتھیانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جیسی بے داغ اور اعلیٰ لکڑی وہ بیچتے تھے ویسی بقول ان کے ”تمہیں باغ بہشت میں شاخ طوبیٰ سے بھی دستیاب نہ ہو گی۔ داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی۔ سو سال بعد بھی دیمک لگ جائے تو پورے دام واپس کر دوں گا۔“ بات دراصل یہ تھی کہ وہ اپنے اصول کے پکے تھے۔ مطلب یہ کہ تمام عمر ”اوپن دکان“ صحیح مال، غلط دام، پر سختی سے کار بند رہے۔ سنا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے فیشن ایبل ”ہیرڈز“ کا دعویٰ ہے کہ ہمارے یہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک دستیاب ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ قیمت بھی دونوں کی ایک ہوتی ہے۔ ہیرڈز اگر لکڑی بیچتا تو بخدا ایسی ہی اور ان ہی دامنوں بیچتا۔

○ یہ چھوڑ کر آئے ہیں

کانپور سے ہجرت کر کے کراچی آئے تھے تو دنیا ہی اور تھی۔ اجنبی ماحول، بیروزگاری، بے گھری اس پر مستزاد۔ اپنی آبائی حویلی کے دس بارہ فوٹو مختلف زاویوں سے کھینچوا لائے تھے۔ ذرا یہ سائڈ پوز دیکھئے۔ اور یہ شاٹ تو کمال کا ہے۔ ہر آئے گئے کو فوٹو دکھا کر کہتے۔ ”یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔“ جن دفاتروں میں مکان کے الاٹ منٹ کی درخواستیں دی تھیں۔ ان کے بڑے افسروں کو بھی کٹہرے کے اس پار سے تصویری ثبوت استحقاق دکھاتے۔ ”یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔“ واسٹ اور شیردانی کی جیب میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، حویلی کا فوٹو ضرور ہوتا تھا۔ یہ درحقیقت ان کا وزٹنگ کارڈ تھا۔ کراچی کے فلیٹوں کو کبھی ماچس کی ڈبیا، کبھی ڈربے، کبھی کابک کہتے۔ لیکن جب تین مہینے جوتیاں چٹکانے کے باوجود ایک کابک میں سر چھپانے کو جگہ نہ ملی تو آنکھیں کھلیں۔ احباب نے سمجھایا ”فلیٹ ایک گھنٹے میں مل سکتا ہے، کسٹوڈین کی ہتھیلی پر پیسہ رکھو اور جس فلیٹ کی چاہو چابی لے لو۔“ مگر قبلہ تو اپنی ہتھیلی پر پیسہ رکھوانے کے عادی تھے، وہ کہاں مانتے۔ مہینوں

فلیٹ الاٹ کروانے کے سلسلے میں بھوکے پیاسے، پریشان حال سرکاری دفاتروں کے چکر کاٹتے رہے۔ زندگی بھر کسی کے مہمان نہ رہے تھے۔ اب بیٹی داماد کے ہاں مہمان رہنے کا عذاب بھی سما۔

○ ابے کیا ہوئے گا

انسان جب کسی گھلا دینے والے کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک ایک برس بن جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے ”ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار“ بیٹی کے گھر نکلے توڑنے یا اس پر بار بننے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کانپور میں کبھی اس کے ہاں کھڑے ایک گلاس پانی بھی پیتے تو ہاتھ پر پانچ دس روپے رکھ دیتے لیکن اب؟ صبح سر جھکائے ناشتہ کر کے نکلتے تو دن بھر خاک چھان کر مغرب سے ذرا پہلے لوٹتے۔ کھانے کے وقت کہہ دیتے کہ ایرانی ہوٹل میں کھا آیا ہوں۔ جوتے انہوں نے ہمیشہ رحیم بخش جفت ساز سے بنوائے، اس لیے کہ اس کے بنائے ہوئے جوتے چرچراتے بہت تھے۔ ان جوتوں کے تلے اب اتنے گھس گئے تھے کہ چرچرانے کے لائق نہ رہے۔ پیروں میں ٹھیکیں پڑ گئیں۔ شیروانیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ بیمار بیوی رات کو درد سے کراہ بھی نہیں سکتی تھی کہ سمہیانے والوں کی خیند خراب ہونے کا اندیشہ تھا ململ کے کرتوں کی لکھنوی کڑھائی میل میں چھپ گئی۔ چنٹیں نکلتے کے بعد آستینیں

انگلیوں سے ایک ایک باشت نیچے لٹکی رہتیں۔ خضابی مونچھوں کا بل تو نہیں گیا، لیکن صرف بل کھائی ہوئی نوکیں سیاہ رہ گئیں۔ چار چار دن نہانے کو پانی نہ ملا۔ موتیا کا عطر لگائے تین مہینے ہو گئے۔

بیوی گھبرا کر بڑے بھولپن سے مضافاتی لہجے میں کہتیں۔ ”اب کیا ہوئے گا؟ ہو گا کی

بجائے ”ہوئے گا“ ان کے منہ سے بہت پیارا لگتا تھا۔ اس ایک فخرے میں وہ اپنی ساری سراسیمگی، معصومیت، بے بسی اور مخاطب کے علم نجوم اور اس کی بے طلب مدد پر بھروسہ..... بھی کچھ سو دیتی تھیں۔ قبلہ اس کے جواب میں ہمیشہ بڑے اعتماد اور تمکنت سے ”دیکھتے ہیں“ کہہ کر ان کی تشفی کر دیتے تھے۔

○ یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام

ہر دکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدمی پر اپنا ایک راز کھول دیتی ہے۔ بودھ گیا کہ چھاؤں تلے بدھ بھی ایک دکھ بھری تپیا سے گزرے تھے۔ جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا، آنکھیں اندھے کنوؤں کی تہ میں بے نور ہو گئیں اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈوری انکی رہ گئی تو گوتم بدھ پر بھی ایک بھید کھلا تھا۔ جیسا اور جتنا اور جس کارن آدمی دکھ بھوگتا ہے، ویسا ہی بھید اس پر کھلتا ہے۔ نروان ڈھونڈنے والے کر نروان مل جاتا ہے۔ اور جو دنیا کی خاطر کشت اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔ سو گلی گلی خاک پھانکنے اور دفتر دفتر دھکے کھانے کے بعد قبلہ کے قلب حزیں پر کچھ القا ہوا۔ وہ یہ کہ قاعدے قانون دانوں اور جابروں نے کمزور دل والوں کو قابو میں رکھنے کے لیے بنائے ہیں۔ جو شخص ہاتھی کی لگام ہی تلاش کرتا رہ جائے وہ کبھی اس پر چڑھ نہیں سکتا۔ جام اس کا ہے جو بڑھ کر خود ساقی کو جام و مینا سمیت اٹھا لے۔ بالفاظ دیگر، جو بڑھ کر تالا توڑ ڈالے، مکان اسی کا ہو گیا۔ کانپور سے چلے تو اپنی جمع جتھا، شجرہ، اسپرنگ سے کھلنے والا چاقو، آخری باکی فیض آبادی کے تین ریکارڈ، مراد آبادی حقے اور صراحی کے سبز کیرئیر اسٹینڈ کے علاوہ اپنی دکان کا تالا بھی ڈھو کر لے آئے تھے۔ علی گڑھ سے خاص طور پر بنوا کر منگوا یا تھا۔ تین سیر سے کم کا نہ ہو گا۔ مذکورہ بالا القا کے بعد بزنس روڈ پر ایک اعلیٰ درجے کا فلیٹ اپنے لیے پسند فرمایا۔ ماربل کی ٹائلز، سمندری ہوا کے رخ کھلنے والی کھڑکیاں جن میں رنگین شیشے لگے تھے۔ دروازے

کے زنگ آلود تالے پر اپنے علیگ تالے کی ایک ہی ضرب سے قلیٹ میں اپنی آباد کاری بلا منت سرکاری۔ گویا پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے الفاظ میں 'اول الذکر کو ثانی الذکر پر مار کر آخر الذکر کا قبضہ لے لیا۔ تختی دوبارہ پینٹ کروا کے لگا دی۔ اس سے پہلے اس پر "کسٹوڈین متروکہ املاک" کا نام لکھا تھا۔ قبلہ عالم جلال میں سے اسے وہیں سے کیلوں سمیت اکھاڑ لائے تھے۔ تختی پر نام کے آگے مضطر کانپوری بھی لکھوا دیا۔ پرانے واقف کاروں نے پوچھا۔ "آپ شاعر کب سے ہو گئے؟" فرمایا "میں نے آج تک کسی شاعر پر دیوانی مقدمہ چلتے نہیں دیکھا، نہ ڈگری، قرقی ہوتے دیکھی۔"

قلیٹ پر قبضہ ہونے کے کوئی چار ماہ بعد قبلہ اپنے چوڑی دار کا گھٹنا رفو کر رہے تھے کہ کسی نے بڑے گستاخانہ انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مطلب یہ کہ نام کی تختی کو پھٹ پھٹایا۔ جیسے ہی انہوں نے ہڑبڑا کر دروازہ کھولا، آنے والے نے خود کا تعارف اس طرح کرایا گویا اپنے عہدے کی چڑاس ان کے منہ پر اٹھا کر دے ماری۔ "افسر، محکمہ 'کسٹوڈین' ایویکوی پراپرٹی" پھر ڈپٹ کر کہا۔ "بڑے میاں! قلیٹ کا الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ۔" قبلہ نے واسٹ کی جیب سے حویلی کا فونو نکال کر دکھایا۔ "یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔"

اس نے فونو کا نوٹس نہ لیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا۔ "بڑے میاں! سنا نہیں، الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ۔" قبلہ نے بڑی رسلان سے اپنے بائیں پیر کا سلیم شاہی جوتا اتارا اور اتنی ہی رسلان سے کہ اس کو گمان تک نہ ہوا کیا کرنے والے والے ہیں، اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولے۔ "یہ ہے یاروں کا الاٹ منٹ آرڈر، کاربن کاپی بھی ملاحظہ فرمائیے گا۔" اس نے اب تک، یعنی تادم تذلیل، رشوت ہی رشوت کھائی تھی جوتے نہیں کھائے تھے پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔

○ جس حویلی میں تھا ہمارا گھر

قبلہ نے بڑے جتن سے لی مارکیٹ میں ایک چھوٹی سی لکڑی کی دکان کا ڈول ڈالا۔ بیوی

کے جیز کے زیور اور ویسلی اسکاٹ کی بندوق اونے پونے بیچ ڈالی۔ کچھ مال ادھار خریدا۔ ابھی دکان ٹھیک سے جی بھی نہ تھی کہ ایک انکم ٹیکس انسپکٹر آ نکلا۔ کھاتے 'رجسٹریشن' روکڑ بھی اور رسید بک طلب کیں۔ دوسرے دن قبلہ ہم سے کہنے لگے۔ "مشتاق صاحب! سنا آپ نے مہینوں جوتیاں چٹکاتا، دفتروں میں اپنی اوقات خراب کرواتا پھرا۔ کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ بھیا کون ہو۔ اب دل لگی دیکھئے، کل ایک انکم ٹیکس کا تیس مار خان دنداتا آیا۔ لہد کبوتر کی طرح سینہ پھلائے۔ میں نے سالے کو یہ دکھا دی۔" یہ چھوڑ کر آئے ہیں، چندرا کر پوچھنے لگا۔ "یہ کیا ہے؟" ہم نے کہا۔ "ہمارے ہاں اسے محل سرا کہتے ہیں۔"

بیچ جھوٹ کا حال مرزا جانیں کہ انہیں سے روایت ہے کہ اس محل سرا کا ایک بڑا فوٹو فریم کروا کے اپنے فلیٹ کی کفندی سی دیوار میں کیل ٹھونک رہے تھے کہ دیوار کے اس پار والے پڑوسی نے آ کر درخواست کی کہ ذرا کیل ایک فٹ اوپر ٹھونکیں تا کہ دوسرے سرے پر میں اپنی شیروانی لٹا سکوں۔ دروازے زور سے کھولنے اور بند کرنے کی دھمک سے اس رنگینی کیل پر ساری محل سرا پنڈولم کی طرح جھولتی رہتی تھی۔ گھر میں ڈاکیا یا غنی دھون بھی آتی تو اسے بھی دکھاتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔"

اس حویلی کا فوٹو ہم نے بھی بار بار دیکھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کیمرے کو موٹا نظر آنے لگا ہے۔ لیکن کیمرے کے ضعف بصارت کو قبلہ اپنے زور بیان سے دور کر دیتے تھے۔ یوں بھی ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے۔ گزرا ہوا درد بھی سنا لگتا ہے۔ آدمی کا جب سب کچھ چھن جائے تو وہ یا تو مست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی فینٹسی لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔

نہ ہو اگر یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا
شجرہ اور حویلی بھی ایک ایسی ہی جائے اماں تھی۔ ممکن ہے
بے ادب نگاہوں کو یہ تصویر میں ڈھنڈار دکھائی دے، لیکن

جب قبلہ اس کی تعمیراتی نزاکتوں کی تشریح فرماتے تو اس کے آگے تاج محل بالکل سیدھا ساٹ گنوار و گھروندا معلوم ہوتا۔ مثلاً دوسری منزل پر ایک دروازہ نظر آتا تھا جس کی چوکھٹ اور کوڑ جھڑ چکے تھے۔ قبلہ اسے فرانسیسی درپچہ بتاتے تھے۔ اگر یہاں واقعی کوئی ولایتی درپچہ تھا تو یقیناً یہ وہی درپچہ ہوگا جس میں جڑے ہوئے آئینہ جہاں نما کو توڑ کر ساری کی ساری ایسٹ انڈیا کمپنی آنکھوں میں اپنے جوتوں کی دھول جھونکتی گزر گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے کا جو بے کواڑ پھانک تھا وہ دراصل شاہ جہانی محراب تھی۔ اس کے اوپر ایک ٹوٹا ہوا چھجا تھا جس پر سر دست ایک چیل قیلولہ کر رہی تھی۔ یہ راجپوتی جھروکے کی باقیات بتائی جاتی تھیں، جن کے عقب میں ان کے دادا کے وقتوں میں ایرانی قالینوں پر آذر بایںجانی طرز کی قوالی ہوتی تھی۔ پچھلے پہر جب نیند کے غلبے سے غلامی آنکھیں مندے لگتیں تو وقفے وقفے سے نقرئی گلاب پاشوں سے حضار محفل پر عرق گلاب مقطر چھڑکا جاتا۔ فرش اور دیواریں قالینوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ ”جتنے پھول غلیچے پہ تھے دتے ہی باہر باغیچے میں تھے۔“ یہاں اطالوی محفل کے کمار چوبی زیر انداز پر گنگا جمنی منقش اگالداں رکھے رہتے تھے، جن میں چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی گلدوریوں کی پیک جب تھوکی جاتی تو بلوریں گلے میں اترتی چڑھتی صاف نظر آتی، جیسے تھرمایٹر میں پارا۔

○ وہ ازدحام کہ عقل دھرنے کی جگہ نہیں

حویلی کے چند اندرونی کلوز اپ بھی تھے۔ کچھ کیمرے کی آنکھ اور کچھ چشم تصور کے رہن منت۔ ایک سہ دری تھی جس کی دو محرابوں کی دراڑوں میں بازنطینی اینٹوں پر کانپوری چڑیوں کے گھونسلے نظر آ رہے تھے ان پر Moorish Arches کی سمت تھی۔ چراغ رکھنے کا ایک آلا (طاقچہ) ایسے آرٹسٹک زاویے سے ڈبا تھا کہ پرنگالی آرج کے

آثار دکھائی پڑتے تھے۔ فونو میں اس کے پہلو میں ایک چوبی گھڑونچی نظر آ رہی تھی جس کا شاہ جہانی ڈیزائن ان کے جد نے آب دار خانہ خاص سے بدست خود چرایا تھا۔ شاہ جہانی ہو یا نہ ہو اس کے مغل ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا، اس لیے اس کی ایک ٹانگ تیموری تھی۔ حویلی کی غلام گردشیں فونو میں نظر نہیں آتی تھیں، لیکن ایک ہسائے کا بیان ہے کہ ان میں گردش کے مارے خاندانی بڑے بوڑھے رلے پھرتے تھے۔ شمالی حصے میں ایک ستون جو مدتیں ہوئیں چھت کا بوجھ اپنے اوپر سے اوتھے کے احسان کی طرح اتار چکا تھا، Roman Pillars کا نادر نمونہ بتایا جاتا تھا۔ حیرت تھی کہ یہ چھت سے پہلے کیوں نہ گرا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چاروں طرف گردن گردن ملے میں دبے ہونے کے باعث، اس کے گرنے کے لیے کوئی خالی جگہ نہ تھی۔ ایک شکستہ دیوار کے ساتھ لکڑی کی بوسیدہ سیڑھی اس طرح کھڑی تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون کس کے سارے کھڑا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق جب دوسری منزل منہدم نہیں ہوئی تھی تو ہیل وکٹورین اسٹائل کا Grand Staircase ہوا کرتا تھا۔ اس غیر موجود چھت پر جہاں اب چگاڈڑیں بھی نہیں لٹک سکتی تھیں، قبلہ ان آہنی کڑیوں کی نشاندہی کرتے جن میں دادا کے زمانے میں المانوی فانوس لٹکے رہتے تھے، جن کی چیمپی روشنی میں وہ گھنگھریالی خنجریاں بجتیں جو کبھی دو کوہان والے بانخری اونٹوں کی محمل نشینوں کے ساتھ آئی تھیں۔ اگر یہ فونو ان کی رنگ کنٹری کے ساتھ نہ دیکھے جاتے تو کسی طرح یہ قیاس و ذہن میں نہیں آ سکتا تھا کہ پانچ سو مربع گز کی ایک لڑکھرائی حویلی میں اتنے فنون تعمیر اور ڈھیر ساری تہذیبوں کا ایسا گھمسان کا ازدحام ہو گا کہ عقل دھرنے کی جگہ نہ رہے گی۔ پہلی مرتبہ فونو دیکھیں تو خیال ہوتا تھا کہ کیمرہ مل گیا ہے۔ پھر ذرا غور سے دیکھیں تو حیرت ہوتی تھی کہ یہ ڈھنڈار حویلی اب تک کیسے کھڑی ہے۔ مرزا کا خیال تھا کہ اب اس میں گرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔

○ وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آتا یاد ہے

حویلی کے صدر دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر جہاں فوٹو میں گھوڑے پر ایک کالا مرغا گردن پھلائے اذان دے رہا تھا، وہاں ایک شکستہ چبوترے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس کے پتھروں کے جوڑوں اور درزوں میں سے پودے روشنی کی تلاش میں گھبرا کر باہر نکل پڑے تھے۔ ایک دن اس چبوترے کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے کہ یہاں آب مصفا سے لبریز سنگ سرخ کا بہشت پہلو حوض ہوا کرتا تھا جس میں ولایتی گولڈ فش تیرتی رہتی تھیں۔ عارف میاں اس میں پائونیر اخبار کی کشتیاں تیرایا کرتے تھے۔ یہ کہتے کہتے قبلہ جوش بیان میں اپنی چھڑی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے پھٹی ہوئی دری پر بہشت پہلو حوض کا نقشہ کھینچنے لگے۔ ایک جگہ فرضی لکیر قدے ٹیڑھی کھینچی تو اسے پیر سے رگڑ کر مٹایا۔ چھڑی کی نوک سے اس بد ذات مچھلی کی طرف اشارہ کیا جو سب سے لڑتی پھرتی تھی۔ پھر ایک کونے میں اس مچھلی کی بھی نشاندہی کی جس کا جی ماندہ تھا۔ انہوں نے کھل کر تو نہیں کہا کہ آخر ہم ان کے خورد تھے، لیکن ہم سمجھ گئے کہ اس مچھلی کا جی کھٹی چیزیں اور سوندھی مٹی کھانے کو بھی چاہ رہا ہو گا۔

قبلہ کبھی ترنگ میں آتے تو اپنے اکلوتے بے تکلف دوست رئیس احمد قدوائی سے فرماتے کہ جوانی میں مئی جون کی ٹیک دوپہر میں ایک حسین دوشیزہ کا کوٹھوں کھوٹھوں ننگے پاؤں پیر ان کی حویلی میں تپتی چھت پر آتا، اب تک (مع ڈانیلاگ) یاد ہے۔ یہ بات مرزا کی سمجھ میں آج تک نہ آئی۔ اس لیے کہ ان کی حویلی سے منزلہ تھی، جبکہ دائیں بائیں پڑوس کے دونوں مکان ایک ایک منزلہ تھے۔ حسین دوشیزہ اگر ننگے پیر ہو اور زیور حیا اتارنے کے لیے اماؤلی بھی ہو، تب بھی یہ کرب ممکن نہیں۔ تاوقتیکہ حسینہ ان کے عشق میں دوشیزہ ہونے کے علاوہ دو لخت بھی نہ ہو جائے۔

○ پلکھن

فونو میں حویلی کے سامنے ایک چھتار ”پلکھن“ اداس کھڑی تھی۔ اس کا ختم ان کے جد اعلیٰ سمند سیاہ زانو پر سوار، کار چوبی کام کے چنے میں چھپا کر قحط کے زمانے میں دمشق سے لائے تھے۔ قبلہ کے قول کے مطابق ان کے پردادا کے ابا جان کہا کرتے تھے کہ ”بے سر و سامانی کے عالم میں یہ ننگ خلاق، ننگ اسلاف، ننگ وطن ننگے سر، ننگے پیر، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر، ننگی تلوار ہاتھ میں لیے خیبر کے سنگاخ ننگے پہاڑوں کو پھلانگتا، وارد ہندوستان ہوا۔“ جو تصویر وہ فخریہ کھینچتے تھے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت بزرگوار کے پاس ستر پوشی کے لیے گھوڑے کی دم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جائیداد، محل، سرا، خدام، مال و متاع سب کچھ وہیں چھوڑ آئے۔ البتہ اثاث البیت کا سب سے قیمتی حصہ یعنی شجرۂ نب اور پلکھن کا ختم ساتھ لے آئے۔ گھوڑا جو انہی کی طرح نجیب الطرفین اور وطن مالوف سے بیزار تھا، ختم اور شجرے کے بوجھ سے رانوں تلے سے اٹلا پڑ رہا تھا۔

○ شجرے کی ہر شاخ پہ تابذ بیٹھا تھا

زندگی کی دھوپ جب کڑی ہوئی اور پیروں تلے سے زمین جائیداد نکل گئی تو آئندہ نسلوں نے اسی شجر اور شجرے کے سائے تلے بسرام کیا۔ قبلہ کو اپنے بزرگوں کی ذہانت و فطانت پر بڑا ناز تھا۔ ان کا ہر بزرگ نادرۂ روزگار تھا اور ان کے شجرے کی ہر شاخ پر ایک تابذ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

قبلہ نے ایک فونو اس پلکھن کے نیچے ٹھیک اس جگہ کھڑے ہو کر کھنچوایا تھا جہاں ان کی ٹال گڑی تھی۔ فرماتے تھے، اگر کسی ختم نامحقق کو میری حویلی کی ملکیت میں شبہ ہو تو ٹال نکال کر دیکھ لے۔ جب آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کی ٹال کہاں گڑی

ہے اور پرکھوں کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں تو وہ منی پلانٹ کی طرح ہو جاتا ہے جو مٹی کے بغیر صرف بوتلوں میں پھلتا پھولتا ہے۔ اپنی نال، پرکھوں اور پلکھن کا ذکر اتنے فخر، غلو اور کثرت سے کرتے کرتے یہ احوال ہوا کہ پلکھن کی جڑیں شجرے میں اتر آئیں، جیسے گھٹنوں میں پانی اتر آتا ہے۔

○ امپورٹڈ بزرگ اور یونانی ٹاک

وہ زمانے اور تھے۔ شرافت اور نجابت کے معیار بھی مختلف تھے۔ جب تک بزرگ اصلی بزرگ امپورٹڈ یعنی ماوراء النہری اور خیبر کے اس پار سے آئے ہوئے نہ ہوں، کوئی ہندوستانی مسلمان خود کو عزت دار اور نجیب نہیں گردانتا تھا۔ غالب کو تو شیخی بگھارنے کے لیے اپنا (فرضی) استاد ملا عبدالصمد تک ایران سے امپورٹ کرنا پڑا۔ قبلہ کے بزرگوں نے جب بے روزگاری اور عسرت سے تنگ آ کر وطن چھوڑا تو آنکھیں نم اور دل گداز تھے۔ بار بار اپنا دست افسوس زانوئے اسپ پر مارتے اور ایک راوی شیعہ بیان کے بقول ایک دوسرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے استغفر اللہ، استغفر اللہ کہتے۔ تا نہ ولایت جس سے ملے، اپنے حسن اخلاق سے اس کا دل جیت لیا۔

پہلے جاں، پھر جان جاں، پھر جان جاں ہو گئے

پھر یہی پیارے لوگ بتدریج

پہلے خاں، پھر خان خاں، پھر خان خاں ہو گئے

حویلی کے آرکی نیکیچر کی طرح قبلہ کے امراض بھی شاہانہ

ہوتے تھے۔ بچپن میں دائیں رخسار پر غالباً آموں کی فصل

میں پھنسی نکلی تھی جس کا داغ باقی تھا۔ فرماتے تھے، جس

سال میرے یہ اورنگ زہی پھوڑا نکلا، اسی سال بلکہ اسی

ہفتے ملکہ وکٹوریہ رانڈ ہوئی۔ ساٹھ کے پیٹے میں آئی تو شاہجہانی

جس بول میں مبتلا ہو گئے۔ فرماتے تھے کہ غالب مغل بچہ تھا۔ ستم پیشہ ڈومنی کو اپنے زہر عشق سے مار ڈالا مگر خود اسی گویا کہ میرے والے عارضے میں مرا۔ ایک خط میں مرقوم ہے کہ جرعد جرعد پیتا ہوں اور قطرہ قطرہ خارج کرتا ہوں۔ دے کا دوبہ ذرا تھمتا تو قبلہ بڑے فخر سے فرماتے کہ فیضی صاحب کو بھی یہی مرض لاحق تھا۔ اس نے ایک قطعہ میں کہا ہے کہ دو عالم میرے سینے میں سما گئے، مگر آدھا سانس کسی طور نہیں سا رہا۔ اپنے والد مرحوم کے بارے میں فرماتے تھے کہ راج روگ یعنی اکبری سگرہنی میں انتقال فرمایا۔ مراد اس سے آنتوں کی ٹی بی تھی۔ مرض تو مرض، قبلہ ناک تک اپنی نہیں تھی، یونانی بتاتے تھے۔

○ ”مرہ“ از غیبِ بروں آید و کارے بکند

قبلہ کو دو غم تھے پہلے غم کا ذکر بعد میں آئے گا کہ وہ جانگسل تھا۔ دوسرا غم دراصل اتنا ان کا اپنا نہیں تھا جتنا بیوی کا تھا جو بیٹے کی تمنا میں گھل رہی تھی۔ اس غریب نے بڑی فمتیں مانیں۔ قبلہ کو شربت میں نقش گھول گھول کر پلائے۔ ان کے تکتے کے نیچے تعویذ رکھے۔ چھپ چھپ کر مزاروں پر چادریں چڑھائیں۔ ہمارے ہاں لوگ جب زندوں سے مایوس ہو جاتے ہیں تو ایک ہی آس باقی رہ جاتی ہے۔

مرہ از غیبِ بروں آید و کارے بکند

پچاس میل کے دائرے میں کوئی مزار ایسا نہ بچا جس کے سرہانے کھڑے ہو کر وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر نہ روئی ہوں کہ اہل قبر کے پسماندگان بھی تدفین کے وقت یوں نہ روئے ہوں گے۔ اس زمانے کے اہل القبور، صاحب کرامات ہوں یا نہ ہوں، کم از کم قبر کے اندر ضرور ہوتے تھے۔ آج کل جیسا حال نہیں تھا کہ مزار اگر خالی از میت

ہے تو غنیمت جاننے ورنہ اللہ جانے اندر کیا دفن ہے۔ جس کا اس دھوم سے عرس شریف منایا جا رہا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ کراچی کے اخباروں میں ایسے اشتہار نہ دیکھتے ہو کہ آج فلاں آستانہ عالیہ پر چادر شریف چڑھائی جا رہی ہے۔ پانچ بجے گاگر شریف جلوس کی شکل میں لے جائی جائے گی۔ پھر اس سے مزار شریف کو غسل شریف دیا جائے گا۔ بعد نماز مغرب لنگر شریف تقسیم ہو گا۔ ہم نے بعض نو دریافت بزرگوں کے نو تعمیر مزاروں کے ضمن میں ”شریف“ پر تاکیداً اتنا زور دیکھا ہے کہ دل میں طرح طرح کے دوسے اٹھنے لگتے ہیں۔ ہم ضعیف الاعتقاد ہیں نہ وہابی لیکن کراچی کے ایک مزار کے بارے میں جو ہمارے سامنے پر ہوا ہے، بالاعلان یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں کہ اس سے متعلق ہر چیز شریف ہے، سوائے صاحب مزار کے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو روانی میں پھیل کر پورا پیرا بن گیا۔ عرض یہ کرنا تھا کہ قبلہ خود کو کسی زندہ پیر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں جب یہ پتا چلا کہ بیوی اولاد نرینہ کی منت مانگنے چوری چھپے نامحرموں کے مزاروں پر جانے لگی ہیں تو بہت خفا ہوئے۔ وہ جب بہت خفا ہوتے تو کھانا چھوڑ دیتے تھے۔ حلوائی کی دکان سے ربڑی، موتی چور کے لڈو اور کچوری لا کر کھا لیتے۔ دوسرے دن بیوی کاسنی رنگ کا دوپٹا اوڑھ لیتیں اور ان کے پسندیدہ کھانے یعنی دو پیانہ، ڈیوڑھی شکر والا زردہ اور بہت تیز مرچوں کے ماش کے دہی بڑے کھلا کر انہیں منا لیتیں۔ قبلہ انہی مرغوبات پر اپنے ایرانی اور عربی النسل بزرگوں کی نیاز دلواتے البتہ ان کے دہی بڑوں میں مرچیں برائے نام ڈلواتے۔ مزاروں پر جانے کی اجازت دے دی مگر اس شرط پر کہ مزار کا مکین ”ذات کا کبہ نہ ہو“ کبہ مرد اور غزل گو شاعر سے پرہ لازم ہے، خواہ مرد ہی کیوں نہ ہو۔ میں ان کے رگ و ریشہ سے واقف ہوں۔“ ان کے دشمنوں سے روایت ہے کہ قبلہ خود بھی جوانی میں شاعر اور انھیال کی طرف سے کبہ تھے۔ اکثر فرماتے ”مرگ کبہ جسنے دارد“

○ کٹے کٹے بلاؤ کے گلے میں گھٹی

رفتہ رفتہ بیوی کو صبر آ گیا۔ ایک بیٹی تھی۔ قبلہ کو وہ عزیز سے عزیز تر ہوتی گئی۔ انہیں اس حد تک صبر آ گیا کہ اکثر فرماتے 'خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس نے بڑا فضل کیا کہ بیٹا نہ دیا' اگر مجھ پر پڑتا تو تمام عمر خوار ہوتا اور اگر نہ پڑتا تو ناخلف کو عاق کر دیتا۔

سیانی بیٹی کتنی بھی چیتی ہو 'ماں باپ کی چھاتی پر پہاڑ ہوتی ہے۔ لڑکی' ضرورت رشتہ کی اشتہاری اصطلاحوں کے مطابق' قبول صورت' سلیقہ شعار' خوش اطوار' امور خانہ داری سے بخوبی واقف۔ لیکن کس کی شامت آئی تھی کہ قبلہ کی بیٹی کا پیغام دے۔ ہمیں آتش نمرود میں کودنے کا ذاتی تجربہ تو نہیں لیکن وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آتش نمرود میں بے خطر کودنے سے کہیں زیادہ خطرناک کام نمرود کے شجرۂ نسب میں کود پڑنا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکے ہیں 'قبلہ ہمارے دوست بشارت کے پھوپھا' چچا اور اللہ جانے کیا کیا لگتے تھے۔ دکان اور مکان' دونوں اعتبار سے' پڑوسی بھی تھے۔ بشارت کے والد بھی رشتے کے حق میں تھے' لیکن رقعہ بھیجنے سے صاف انکار کر دیا کہ بہو کے بغیر پھر بھی گزارا ہو سکتا ہے لیکن ناک اور ٹانگ کے بغیر تو شخصیت نامکمل سی معلوم ہو گی۔ بشارت نے ریل کی پٹری سے خود کو بندھوا کر بڑی لائن کے انجن سے اپنی خودکشی کروانے کی دھمکی دی۔ رسیوں سے بندھوانے کی شرط خود اس لیے لگا دی کہ عین اس وقت پر اٹھ کر بھاگ نہ جائیں۔ لیکن ان کے والد نے صاف کہہ دیا کہ اس کٹ کٹے بلاؤ کے گلے میں تمہیں گھٹی ڈالو۔

قبلہ "مدمنع" بد لحاظ 'منہ پھٹ مشہور سی نہیں' تھے بھی وہ دل سے بلکہ بے دلی سے بھی۔ کسی کی عزت نہیں کرتے تھے۔ دوسرے کو حقیر سمجھنے کا کچھ نہ کچھ جواز ضرور نکال لیتے۔ مثلاً کسی کی عمر ان سے ایک مہینہ بھی کم ہو تو اسے لونڈا کہتے اور

اگر ایک سال زیادہ ہو تو بڑھنوا!

○ جے و س ہ اور چار نقطے

بشارت نے ان دنوں بی اے کا امتحان دیا تھا اور پاس ہونے کا امکان، بقول ان کے ففٹی ففٹی تھا۔ ففٹی ففٹی اتنے زور، فخر اور وثوق سے کہتے اپنی کاٹا تول نصف نصف نالائق سے ممتحن کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ کیرم اور کوٹ پیس کھیلتے۔ روحوں کو بلاتے اور ان سے ایسے سوال کرتے کہ زندوں کو حیا آتی۔ کبھی دن بھر بیٹھے نظیر اکبر آبادی کے کلیات میں وہ نقطے والے بلیںک پر کرتے رہتے جو منشی نول کشور پریس نے بہ تقاضائے تمذیب و تعزیرات ہند خالی چھوڑ دیئے تھے۔ گفتگو میں ہر جملے کے بعد شعر کا ”ٹھیکا“ لگاتے۔ افسانہ نویسی کی مشق و مشقت بھی جاری تھی۔ نیاز فتح پوری کی اطلسی فقرہ طرازی اور ابوالکلام کی جھومتی جھامتی گج گمانی نثر کی چھاپ، ایک انہی پر موقوف نہیں، اچھے اچھوں کی طرز تحریر پر تھی۔ بعضوں پر ماتھے کے جھومر کی مانند۔ کچھ پر دھوبی کے نشان کی طرح۔ اور کچھ پر اس طرح جیسے انگریز ملاح اپنی محبوباؤں کی تصویریں جسم پر گدوا لیتے ہیں۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ کسی کی محتاجی نہیں۔ اردو نثر اس زمانے میں فیل پا میں مبتلا تھی۔ اس میں کچھ افادہ ہوا تو معجون فلک سیر کھا کر ٹیگوری ادب پاروں کے اژن غالیچے پر سوار ہو گئی۔ بشارت کے ایک افسانے کا کلانمکس کچھ اس طرح تھا۔

”انجم آراء کی حسن آفرینیوں، سحر انگیزیوں اور حشر سامانیوں سے مشام جان معطر تھی۔ وہ لغزیدہ لغزیدہ قدموں سے آگے بڑھی اور فرط حیا سے اپنی اطلسی بانہوں کو اپنی ہی دزدیدہ دزدیدہ آنکھوں پر رکھا۔ سلیم نے انجم آراء کے دست حنائی کو اپنے آہنی ہاتھ میں لے کر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی ہیرا تراش کلائی اور ساق بلوریں کو دیکھا اور گلنار سے لبوں پر چار نقطے ثبت کر دیئے۔“

اس زمانے میں لفظ ”بوسہ“ فحش سمجھا جاتا تھا لہذا اس کی جگہ نقطے لگا دیئے جاتے تھے۔ بشارت گن کر اتنے ہی نکتے لگاتے جن کی اجازت اس وقت کے حالات، حیا یا ہیروئین نے دی ہو۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں انجمن ترقی اردو کے رسالے میں ایک مضمون چھپا تھا۔ اس میں جہل جہل لفظ بوسہ آیا وہاں وہاں مولوی عبدالحق نے بر بنائے تہذیب اس کے جے یعنی ب، و، س، ہ چھاپ کر الٹا اس کی لذت و طوالت میں اضافہ فرما دیا۔ یہاں ہمیں ان کا یا اپنے حبیب لبیب کی طرز نگارش کا مذاق اڑانا مقصود نہیں، ہر زمانے کا اپنا اسلوب اور آہنگ ہوتا ہے۔ لفظ کبھی انگرکھا، کبھی عبا و عمامہ، کبھی ڈنر جیکٹ یا فوٹس کیپ، کبھی چیر میں پائل یا بیڑی پننے نظر آتے تھے۔ اور کبھی کوئی مداری اپنی قاموسی ڈگڈگی بجاتا ہے تو لفظوں کے سدھے بندر ناچنے لگتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنا سن پیدائش اس طرح بتاتے ہیں۔

”یہ غریب الدیار عمد، نا آشنائے عصر، بیگانہ خویش، نمک پروردہ ریش، خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد، مدعو بابی الکلام ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم۔“

اب لوگ اس طرح نہیں لکھتے۔ اس طرح پیدا بھی نہیں ہوتے۔ اتنی فحالت، طوالت و افیت تو آج کل سیزرین پیدائش میں بھی نہیں ہوتی۔

○ کہ آتش فشاں میں چھلانگ

بالآخر ایک سہانی صبح بشارت نے بقلم خود رقعہ لکھا اور رجسٹری سے بھجوا دیا۔ حالانکہ مکتوب الیہ کے مکان کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ رقعہ ۲۳ صفحات اور کم و بیش پچاس اشعار پر مشتمل تھا جن میں سے آدھے اپنے اور آدھے عندلب شادانی کے تھے جن سے قبلہ کے برادرانہ مراسم تھے۔ اس زمانے میں رقعے زعفران سے لکھے جاتے تھے۔ لیکن اس رقعے کے لیے تو زعفران کا ایک کھیت بھی ناکافی ہوتا۔ لہذا صرف القاب و آداب زعفران

سے اور بقیہ مضمون سرخ روشنائی سے زیند کے موٹے نب سے لکھا۔ جن حصوں پر بطور خاص توجہ دلائی مقصود تھی انہیں نیلی روشنائی سے باریک حروف میں لکھا۔ مدعا اگرچہ گستاخانہ لیکن لہجہ برابر فدیوانہ اور مضمون بے حد خوشامدانه تھا۔ قبلہ کے حسن اخلاق، شفقت، خوش خوئی، خوش معاملگی، صلہ رحمی، نرم گفتاری، مردانہ وجاہت مختصر یہ کہ ہر اس خوبی کی جی کھول کر تعریف کی جس کا شائبہ تک قبلہ کے کردار میں نہ تھا۔ ساتھ ساتھ قبلہ کے دشمنوں کی نام بنام ڈٹ کر برائی کی۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ کہ ۲۳ صفحات کے کوزے میں بند کر کے کھول کرنا انہی کا کام تھا۔ بشارت نے جی کڑا کر کے یہ تو لکھ دیا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس وضاحت کی ہمت نہ پڑی کہ کس سے۔ مضمون بے ربط و ثولیدہ سہمی لیکن قبلہ اپنے حسن سیرت اور دشمنوں کی حرامزدگیوں کے بیان سے بہت خوش ہوئے۔ اس سے پہلے ان کو کسی نے وجہ بھی نہیں کہا تھا۔ دو دفعہ پڑھ کر اپنے منہ کو پکڑا دیا کہ تم ہی پڑھ کر بتاؤ صاحبزادے کس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ اوصاف تو میرے بیان کئے ہیں۔

قبلہ دیر تک اپنے مبینہ اوصاف حمیدہ پر دل ہی دل میں اترایا کئے۔ گلیشنر تھا کہ پکھلا جا رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے منہ جی سے گویا ہوئے۔ بعضے بعضے بے استادے شاعر کے اشعار میں کبھی کبھی الف گرتا ہے۔ اس کے اشعار میں تو الف سے لے کرے تک سارے حروف حتمی ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے ہیں۔ جیسے عید گاہ میں نمازی ایک دوسرے کی کمر پر رکوع و سجود کر رہے ہوں۔

بشارت کی جرات زندانہ کی کہانی جس نے سنی ششدر رہ گیا۔ خیال تھا کہ کوہ آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔ قبلہ نے اگر ازراہ ترحم سارے خاندان کو قتل نہیں کیا تو کم از کم ہر ایک کی ٹانگیں ضرور توڑ دیں گے۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ قبلہ نے بشارت کو اپنی غلامی میں قبول کر لیا۔

قبلہ کی دکانداری اور اس کی لائی ہوئی آفتوں کی ایک مثال ہو تو بیان کریں۔ کوئی گاہک اشارتا یا کنایتاً بھی ان کی کسی بات پر بھاؤ پر شک کرے تو پھر اس کی عزت ہی نہیں ہاتھ پیر کی بھی خیر نہیں۔ ایک دفعہ غفلت میں تھے۔ لکڑی کی قیمت چھوٹے ہی دس روپے میں بتا دی۔ دیہاتی گاہک نے دس روپے لگائے اور یہ گلی یدتے ہوئے مارنے کو دوڑے کہ جٹ گنوار کو اتنی جرات کیسے ہوئی دکان میں ایک ٹوتی ہوئی چارپائی پڑی رہتی تھی جس کے بانوں کو چرا چرا کر آرا کھینچنے والے مزدور چلم میں بھر کے سلفے کے دم لگاتے تھے۔ قبلہ جب باقاعدہ مسلح ہو کر حملہ کرنا چاہتے تو اس چارپائی کا سیروا یعنی سرہانے کی پٹی نکال کر اپنے دشمن یعنی گاہک پر جھپٹتے۔ اکثر سیروے کو پچکارتے ہوئے فرماتے۔ ”عجب سخت جان ہے۔ آج تک اس کا فریکچر نہیں ہوا۔ لٹھ رکھنا بزدلوں اور گنواروں کا وتیرہ ہے۔ اور لاشی چلانا‘ قصائی‘ کنبڑوں‘ غنڈوں اور پولیس کا کام ہے۔“ استعمال کے بعد سیروے کی فرسٹ ایڈ کر کے یعنی انگوچھے سے اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر واپس جھلنگے میں لگا دیتے۔ اس طریقہ واردات میں غالباً یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ چارپائی تک جانے اور سیروا نکالنے کے وقفے میں اگر غصے کو ٹھنڈا ہوتا ہے تو ہو جائے۔ اور اگر ان کے معتب کی بینائی اور عقل زائل نہیں ہوئی ہے تو وہ اپنی ٹانگوں کے استعمال میں مزید بخل سے کام نہ لے۔ ایک قدیم چینی کہاوت ہے کہ لڑائی کے جو ۳۷۰ پینترے داناؤں نے گنوائے ہیں۔ ان میں جو پینترے سب سے کارآمد بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بھاگ لو۔ اس کی تصدیق ہندو دیو مالا سے بھی ہوتی ہے۔ راون کے دس سر اور بیس ہاتھ تھے۔ پھر بھی مارا گیا۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ بھاگنے کے لیے صرف دو ٹانگیں تھیں۔ حملہ کرنے سے پہلے قبلہ کچھ دیر خوشیاں تا کہ مخالف اپنی جان بچانا چاہتا ہے تو بچا لے۔ فرماتے تھے‘ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی شخص کی ٹھکانائی کرنے سے پہلے میں نے اسے گلی دے کر خبردار نہ کیا ہو۔ کیا شعر ہے وہ بھلا سا؟ ہاں!

پشہ سے سیکھے شیوہ مردانگی کوئی
جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

URDU4U.COM

انسانی کردار میں مجھڑ کی صفات پیدا کر کے اتنا فخر کرتے ہم نے انہی کو دیکھا۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس، ایم اے، بی ٹی نے ان کے خیالات سے متاثر ہو کر اپنے دو بقراطی لیکچروں کے مجموعہ بعنوان ”خطبات چاکسو“ کی آؤٹ لائن بنائی۔ ”مشرقی شعر و روایت میں پشہ کا مقام“ تاریخی تناظر میں معروضی زاویے سے ”اور ”موازنہ پشہ و شاہین“ ہمارے قارئین ماشاء اللہ عاقل ہیں۔ اشارے کی بھی ضرورت نہیں کہ میدان کس کے ہاتھ رہا۔

○ ہوں لائقِ تعزیر پہ الزام غلط ہے

قبلہ کی ہیبت سب کے دلوں پر بیٹھی تھی، بجز دائیں جانب والے دکاندار کے۔ وہ قنوج کا رہنے والا، نہایت خود سر، ہتھ پھٹ، بد معاملہ اور بد زبان آدمی تھا۔ عمر میں قبلہ سے بیس سال کم ہو گا۔ یعنی جوان اور سرکش۔ چند سال پہلے تک اکھاڑے میں باقاعدہ زور کرتا تھا، پہلوان سیٹھ کہلاتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک گاہک قبلہ کی سرحد میں ۳/۴ داخل ہو چکا تھا کہ پہلوان سیٹھ اسے پکڑ کر گھسیٹا ہوا اپنی دکان میں لے گیا اور قبلہ ”مہاراج! مہاراج!“ پکارتے ہی رہ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی دکان میں گھس کر گاہک کر چھڑا کر لانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پہلوان سیٹھ نے ان کی وہ گلی دی جو وہ خود سب کو دیا کرتے تھے۔

پھر کیا تھا۔ قبلہ نے اپنے اسلحہ خانہ خاص یعنی چارپائی سے پٹی نکالی اور ننگے پیر دوڑتے ہوئے اس کی دکان میں دوبارہ داخل ہوئے۔ گاہک نے بچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی اور اولین غفلت میں اپنا دانت تڑوا کر مصالحتی کارروائی سے ریٹائر ہو گیا۔ دریدہ دہن

پہلوان سینٹھ دکان چھوڑ کر بگٹ بھاگ۔ قبلہ اس کے پیچھے سرپٹ۔ تھوڑی دور جا کر اس کا پاؤں ریل کی پنزری میں الجھا اور وہ منہ کے بل گرا۔ قبلہ نے جا لیا۔ پوری طاقت سے ایسا وار کیا کہ پٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ معلوم نہیں اس سے چوٹ آئی یا ریل کی پنزری پر گرنے سے۔ وہ دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ اس کے گرد خون کی تلیا سی بن گئی۔

پہلوان سینٹھ کی ٹانگ کی مٹی پل فریکچر میں گنگرین ہو گیا اور ٹانگ کاٹ دی گئی۔ فوجداری مقدمہ بن گیا۔ اس نے پولیس کو خوب پیر کھلایا۔ اور پولیس نے دیرینہ عداوت کی بنا پر قبلہ کا اقدام قتل میں چالان پیش کر دیا۔ تعزیرات ہند کی اور بہت سی دفعات بھی لگا دیں۔ لمبی چوڑی فرد جرم سن کر قبلہ فرمانے لگے کہ ٹانگ کا نہیں، تعزیرات ہند کا مٹی پل فریکچر ہوا ہے۔ پولیس گرفتار کر کے لے جانے لگی تو بیوی نے پوچھا۔ ”اب کیا ہوئے گا؟“ کندھے اچکاتے ہوئے بولے۔ ”دیکھیں گے“ عدالت مجسٹریٹ میں بچ بچاؤ کرنے والے گاہک کا دانت اور آلہ قتل یعنی چارپائی مع خون پلائی ہوئی پٹی کے بطور Exhibits پیش ہوئے۔ مقدمہ سیشن سپرد ہو گیا۔ قبلہ کچھ عرصے ریمانڈ پر جوڈیشل حوالات میں رہے تھے۔ اب جیل میں باقاعدہ خونوں، ڈاکوؤں، جیب کتروں اور عادی مجرموں کے ساتھ رہنا پڑا۔ تین چار مچیتوں کے بعد وہ بھی قبلہ کو اپنا چچا کہنے اور ماننے لگے۔

ان کی طرف سے یعنی بحیثیت وکیل صفائی، کانپور کے ایک لائق بیرسٹر مصطفیٰ رضا قزلباش نے پیروی کی۔ مگر وکیل اور موکل کا کسی ایک نکتے پر بھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ مثلاً قبلہ بھند تھے کہ حلف اٹھا کر یہ بیان دوں گا کہ مضروب نے اپنی ولدیت غلط لکھوائی ہے۔ اس کی صورت اپنے باپ سے نہیں، باپ کے ایک ادباش دوست سے ملتی ہے۔ بیرسٹر موصوف یہ موقف اختیار کرنا چاہتے تھے کہ چوٹ ریل کی پنزری پر گرنے سے آئی ہے نہ کہ ملزم کی مبینہ ضرب سے۔ ادھر قبلہ کمرۂ عدالت میں فلمی بیرسٹروں کی طرح ٹٹل ٹٹل اور کٹھڑے کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ اعلان کرنا چاہتے تھے کہ میں سپاہی بچہ ہوں۔ دکانداری میرے لیے کبھی ذریعہ عزت نہیں رہی۔ بلکہ عرصہ دراز سے ذریعہ

آمدنی بھی نہیں رہی۔ ٹانگ پر وار کرنا ہماری شکن سپہ گری اور شیوہ مردانگی کی توہین ہے۔ میں تو دراصل اس کا سر پاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ لہذا اگر مجھے سزا دینی ہی ضروری ہے تو ٹانگ توڑنے کی نہیں، غلط نشانے کی دیجئے۔ ہوں لائق تعزیر پہ الزام غلط ہے۔

○ ایام اسیری اور جون کا ”بلڈ ٹیسٹ“

عدالت میں فوجداری مقدمہ چل رہا تھا۔ قرائن کہتے تھے کہ سزا ہو جائے گی اور خاصی لمبی۔ گھر میں ہر پیشی کے دن رونا بیٹا مچتا۔ اعزہ اور احباب اپنی جگہ پریشان اور سراسیمہ کہ ذرا سی بات پر یہ نوبت آگئی۔ پولیس انہیں ہتھکڑی پہنائے سارے شر کا چکر دلا کر عدالت میں پیش کرتی اور پہلوان سیٹھ سے حق الخدمت وصول کرتی۔ بھولی بھالی بیوی کو یقین نہیں آتا تھا۔ ایک ایک سے پوچھتیں۔ ”بھیا کیا سچ سچ کی ہتھکڑی پہنائی تھی؟“ عدالت کے اندر اور باہر قبلہ کے تمام دشمنوں یعنی سارے شر کا ہجوم ہوتا۔ سارے خاندان کی ٹاک کٹ گئی۔ مگر قبلہ نے کبھی منہ پر تولیہ اور ہتھکڑی پر رومال نہیں ڈالا۔ گشت کے دوران مونچھوں پر تاؤ دیتے تو ہتھکڑی جھن جھن کرتی۔ رمضان آئے تو کسی نے مشورہ دیا کہ نماز روزہ شروع کر دیجئے۔ اپنے کان ہی پور کے مولانا حسرت موہانی تو روزے میں چکی بھی پیستے تھے۔ قبلہ نے بڑی حقارت سے جواب دیا۔ ”لاحول ولا قوہ! میں شاعر تھوڑا ہی ہوں۔ یہ نام ہو گا غم روزگار سبہ نہ سکا۔“

بیوی نے کئی مرتبہ پچھوایا۔ ”اب کیا ہوئے گا؟“

ہر بار ایک ایک ہی جواب ملا۔ ”دیکھ لیں گے۔“

طیش کے عالم میں جو بات منہ سے نکل جائے یا جو حرکت سرزد ہو جائے اس پر انہیں کبھی نادم ہوتے نہیں دیکھا۔ فرماتے تھے کہ آدمی کے اصل کردار کی جھلک تو طیش کے کوندے میں ہی دکھائے دیتی ہے۔ چنانچہ اپنے کسی کرتوت یعنی اصل کردار پر پشیمان

یا پریشان ہونے کو مردوں کی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ایک دن ان کا بھتیجا شام کو جیل میں کھانا اور جوئیں مارنے کی دوا دے گیا۔ دوا کے اشتہار میں لکھا گیا تھا کہ اس کے ملنے سے جوئیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ پھر انہیں آسانی سے پکڑ کر مارا جاسکتا ہے۔ جوں اور لیکھ مارنے کی مروجہ ترکیب بھی درج تھی۔ یعنی جوں کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر رکھو اور دائیں انگوٹھے کے ناخن سے چٹ سے کچل دو۔ اگر جوں کے پیٹ سے کالا یا گہرا عنابی خون نکلے تو فوراً ہماری دوا "اکسیر جالینوس" مصفی خون پی کر اپنا خون صاف کیجئے۔ پرچے میں یہ ہدایت بھی تھی کہ دوا کا کورس اس وقت تک جاری رکھئے جب تک کہ جوں کے پیٹ سے صاف شدہ سرخ خون نہ نکلنے لگے۔ قبلہ نے جنگلے کے اس طرف سے اشارے سے بھتیجے کو کہا کہ اپنا کان میرے منہ کے قریب لاؤ۔ پھر اس سے کہا کہ برخوردارا زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ دنیا، اس جیل سمیت سرائے فانی ہے۔ غور سے سنو۔ یہ میرا حکم بھی ہے اور وصیت بھی۔ لوہے کی الماری میں دو ہزار روپے آڑے وقت کے لیے رومی کے اخباروں کے نیچے چھپا آیا تھا۔ یہ رقم نکال کر الن (شہر کا نامی غنڈہ) کو دے دینا۔ اپنی چچی کو میری طرف سے ولاسا دینا۔ الن کو میری دعا کہنا اور یہ کہنا کہ ان چھوٹوں کی ایسی ٹھکانی کرے کہ گھر والے صورت نہ پہچان سکیں۔ یہ کہہ کر اخبار کا ایک مسلا ہوا پر نہ بھتیجے کو تھما دیا، جس کے حاشیہ پر ان چھ گواہان استغاثہ کے نام درج تھے، جن کو پٹوانے کا انہوں نے جیل میں اس وقت منصوبہ بنایا تھا۔ جب ایسی ہی حرکت پر انہیں آج کل میں سزا ہونے والی تھی۔

ایک دفعہ اتوار کو ان کا بھتیجا جیل میں ملاقات کو آیا اور ان سے کہا کہ جیلر تک با آسانی سفارش پہنچائی جاسکتی ہے۔ اگر آپ کا جی کسی خاص کھانے مثلاً زردہ یا دہی بڑے شوق کی مثنوی، سگریٹ یا مہوے کے پان کو چاہے تو چوری چھپے ہفتے میں کم از کم ایک بار آسانی سے پہنچایا جاسکتا ہے۔ چچی نے تاکید سے کہا ہے۔ عید نزدیک آ رہی ہے۔

رو رو کر آنکھیں سجالی ہیں۔

قبلہ نے جیل کے کھدر کے نیکر پر دوڑتا ہوا کھٹل پکڑتے ہوئے کہا۔ مجھے قطعی کسی چیز کی حاجت نہیں۔ اگلی دفعہ آؤ تو سراج فونو گرافر سے حویلی کا فونو کھنچوا کے لے آنا۔ کئی مہینے ہو گئے دیکھے ہوئے۔ جدھر تمہاری چچی کے کمرے کے جتن ہے، اس رخ سے کھینچے تو اچھی آئے گی۔

سنتری نے زمین پر زور سے بوٹ کی تھاپ لگاتے اور تھری ناٹ تھری رائفل کا کندہ بجاتے ہوئے ڈپٹ کر کہا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ عید کا خیال کر کے بھتیجے کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ قبلہ نے اس کا کان پکڑا اور کھینچ کر اپنے منہ تک لانے کے بعد کہا، ہاں! ہو سکے تو جلد ایک تیز چاقو، کم از کم چھ انچ کے پھل والا، ڈبل روٹی یا عید کی سویوں میں چھپا کر بھجوا دو۔ دوم، بمبئی میں Pentangular شروع ہونے والا ہے۔ کسی ترکیب سے مجھے روزانہ اسکور معلوم ہو جائے تو واللہ! ہر روز ”روز عید“ ہو، ہر شب ”شب برات“ خصوصاً وزیراعلیٰ کا اسکور دن کے دن معلوم ہو جائے تو کیا کہنا۔ سزا ہو گئی۔ ڈیڑھ سال قید بامشقت۔ فیصلہ سند۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ گویا آسمان سے پوچھ رہے ہوں۔ ”تو دیکھ رہا ہے“ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ”How's That?“ پولیس نے ہتھکڑی ڈالی۔ قبلہ نے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ جیل جاتے وقت بیوی کو کہلا بھیجا کہ آج میرے جد اعلیٰ کی روح پر فتوح کتنی مسرور ہو گی۔ کتنی خوش نصیب بی بی ہو تم کہ تمہارا دولہا (جی ہاں! یہی لفظ استعمال کیا تھا) ایک حرام زادے کی ٹھکائی کر کے مردوں کا زیور بنے جیل جا رہا ہے۔ لکڑی کی ٹانگ لگوا کر گھر نہیں آ رہا۔ دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھنا۔ بھتیجے کو تاکید کی کہ حویلی کی مرمت کراتے رہنا۔ اپنی چچی کا خیال رکھنا۔ ان سے کہنا، یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ دل بھاری نہ کریں اور جمعہ کو کاسنی دوپٹا اوڑھنا نہ چھوڑیں۔

بیوی نے پکھوایا اب کیا ہوئے گا؟
جواب ملا، دیکھا جائے گا

○ ٹارزن کی واپسی

دو سال تک دکان میں تالا پڑا رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد چپ چاپتے کہیں اور چلے جائیں گے۔ قبلہ جیل سے چھوٹے۔ ذرا جو بدلے ہوں۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں جوڑ نہیں تھے۔ جاپانی زبان میں کہاوت ہے کہ بندر درخت سے زمین پر گر پڑے، پھر بھی بندر ہی رہتا ہے۔ سو وہ بھی ٹارزن کی طرح! Aauuaauuuu چنگھاڑتے جیل سے نکلے۔ سیدھے اپنے آبائی قبرستان گئے۔ والد کی قبر کی پائنتی کی خاک سر پر ڈالی۔ فاتحہ پڑھی اور کچھ سوچ کر مسکرا دیئے۔ دوسرے دن دکان کھولی۔ کیبن کے باہر ایک بلی گاڑ کر اس پر ایک لکڑی کی ٹانگ بڑھنی سے بنوا کر لٹکا دی۔ صبح اور شام اس کو رسی سے کھینچ کر اس طرح چڑھاتے اور اتارتے تھے جس طرح اس زمانے میں چھاؤنیوں میں یونین جیک چڑھایا اتارا جاتا تھا۔ جن نادہندوں نے دو سال سے رقم دبا رکھی تھی انہیں یاد دہانی کے دھمکی آمیز خطوط لکھے۔ اور اپنے دستخطوں کے بعد بریکٹ میں (سزا یافتہ) لکھا۔ جیل جانے سے پہلے خطوط میں خود کو بڑے فخر سے ”نگ اسلاف“ لکھا کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس سے اتفاق کرے۔ اتفاق تو درکنار مارے ڈر کے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اپنے نام کے ساتھ نگ اسلاف کے بجائے ”سزا یافتہ“ اس طرح لکھنے لگے جیسے لوگ ڈگریاں یا خطاب لکھتے ہیں۔ قانون اور جیل سے ان کی جھجک نکل چکی تھی۔

تو قبلہ جیسے گئے تھے ویسے ہی جیل کٹ کر واپس آ گئے۔ طنطنے اور آواز کے کڑکے میں ذرا فرق نہ آیا۔ اس اثنا میں اگر زمانہ بدل گیا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ اب ان کی رائے میں قطعیت کے علاوہ فقطیت بھی پیدا ہو گئی۔ ان کا فرمایا

ہوا مستند تو پہلے ہی تھا، اب مختتم بھی ہو گیا۔ سیاہ مٹل کی رام پوری ٹوپی اور زیادہ ترچھی ہو گئی۔ یعنی اتنی جھکا کر ٹیڑھی اوڑھنے لگے کہ دائیں آنکھ ٹھیک سے نہیں کھول سکتے تھے۔ اب کبھی بیوی گھبرا کے ”اب کیا ہوئے گا؟“ کہیں تو وہ ”دیکھتے ہیں“ کے بجائے ”دیکھ لیں گے“ اور ”دیکھتی جاؤ“ کہنے لگے۔ رہائی کے دن نزدیک آئے تو داڑھی کے علاقے کے بال بھی گھسے دار مونچھوں میں شامل کر لیے جو اب اتنی گھنی ہو گئی تھیں کہ ایک ہاتھ سے پکڑ کر انہیں اٹھاتے تب کہیں دوسرے ہاتھ سے منہ میں لقمہ رکھ پاتے تھے۔ جیل ان کا کچھ بگاڑ نہ سکی۔ فرماتے تھے ”ہمیں تیسرے بیرک میں ایک منشی فاضل پاس جعلیا ہے۔ فصاحت یار خان۔ نعن اور دھوکہ دہی میں تین سال کی کلٹ رہا ہے، با مشقت۔ پہلے شعلہ، اب حزیں تخلص کرتا ہے۔ بلا کا بسیار گو۔ چکی پیستے میں اپنی ہی تانہ غزل گاتا رہتا ہے۔ موٹا چمٹا ہے اور پٹتا ہے۔ اب یہ کوئی شاعری تو ہے نہیں۔ تس پر خود کو غالب سے کم نہیں سمجھتا۔ حلال کہ مماثلت صرف اتنی ہے کہ دونوں نے جیل کی ہوا کھائی۔ خود کو روپیلا بتاتا ہے۔ ہو گا۔ لگتا نہیں۔ قیدیوں سے بھی منہ چھپائے پھرتا ہے۔ اپنے بیٹے کو ہدایت کر رکھی ہے کہ میرے بارے میں کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ والد صاحب عارضی طور پر نقل مکانی کر گئے ہیں۔ جیل کو کبھی جیل نہیں کہتا، زنداں کہتا ہے۔ اور خود کو قیدی کے بجائے اسیر۔ ارے صاحب! غنیمت ہے جیلر کو عزیز مصر نہیں کہتا۔ اسے تو چکی کو آسیا کہنے میں بھی عار نہ ہوتی، مگر میں تو جانوں پاٹ کی عربی معلوم نہیں۔ شاید وہ سمجھتا ہے کہ استفراغ اور اسہال کہنے سے قے دست تو بند نہیں ہوتے، بدبو جاتی رہتی ہے۔ ٹھیک ہی سمجھتا ہے۔ کس واسطے کہ اس کے باپ کا انتقال ہینے میں ہوا تھا۔ ارے صاحب! میں یہاں کسی کی جیب کلٹ کر تھوڑا ہی آیا ہوں۔ شیر کو پنجرے میں قید کر دو، تب بھی شیر ہی رہتا ہے۔ گیدڑ کو کچھار میں آزاد چھوڑ دو، اور زیادہ گیدڑ ہو جائے گا۔ اب ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ جیل کا گھٹنا (گھٹنوں تک نیکر) پہنتے ہی طبیعت میں سوز و گداز

پیدا ہو جائے۔“ بلکہ ہمیں تو قبلہ کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ پھٹا ہوا کپڑا پہننے اور جیل میں قیام فرمانے کو سنت یوسفی سمجھتے ہیں۔ ان کے مزاج میں جو ٹیڑھ تھی وہ کچھ اور بڑھ گئی۔ کوئے پر کتنے ہی صدے گزر جائیں، کتنا ہی بوڑھا ہو جائے، اس کے پر و بال کالے ہی رہتے ہیں۔ اکل کھرے کھرے، کھر دے کھرے یا کھوٹے، وہ جیسے کچھ بھی تھے ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔

تن اجرا من گاؤلا بگلا جیسے بھیں
ایسے سے کاگا، بھلے باہر بھیتر ایک

فرماتے تھے، الحمد للہ! میں منافق، یا کار نہیں۔ میں نے گناہ کو ہمیشہ گناہ سمجھ کر کیا۔ دکان دو سال سے بند پڑی تھی۔ چھوٹ کر گھر آئے تو بیوی نے پوچھا۔ ”اب کیا ہوئے گا؟“
”بیوی! ذرا تم دیکھتی جاؤ۔“

○ لبے معشوق

اب کے دکان چلی اور ایسی چلی کہ اوروں ہی کو نہیں خود انہیں بھی حیرت ہوئی۔ دکان کے باہر اسی شکار گاہ یعنی کیبن میں اسی نہرے سے گاؤ تکلے کی ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ مگر زاویہ پسر گیا تھا۔ پیروں کا رخ اب فرش کی بہ نسبت آسمان کی طرف زیادہ تھا۔ جیل میں سکونت پزیر ہونے سے پہلے قبلہ گاہک کو ہاتھ کے ملتجیانہ اشارے سے بلایا کرتے تھے۔ اب صرف انگشت شہادت کے خفیف سے اشارے سے طلب کرنے لگے۔ انگلی کو اس طرح حرکت دیتے جیسے ڈانواں ڈول پتنگ کو ٹھمکی دے کر اس کا قبلہ درست کر رہے ہوں۔ حقے کی نے میں اب ایک فٹ کا اضافہ کر لیا۔ حقہ اب پیتے کم، گزر گزرتے

زیادہ تھے۔ بدبودار دھوئیں کا چھلا اس طرح چھوڑتے کہ گاہک کی ناک میں نتھ کی طرح لٹک جاتا۔ اکثر فرماتے ”واجد علی شاہ“ جان عالم پیانے، جو شخص کبھی حقے کے پاس سے بھی گزرا ہے، وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جان عالم پیا کا پالا کیسے لبوں سے پڑا ہو گا۔ چنانچہ معزولی کے بعد وہ فقط حقہ اپنے ہمراہ میا برج لے گئے۔ پری خانے کے تمام معشوق لکھنؤ میں ہی چھوڑ گئے۔ اس لیے کہ معشوق کو نیچہ پکڑ کے گزرگرایا نہیں جا سکتا۔

○ بلی پہ لٹکا دوں گا

منشی دیا نرائن غم کے رسالے ”زمانہ“ کے کاتب سے عرفی کا مشہور شعر احاطے کی دیوار پر ڈامر سے لکھوا دیا۔

عرفی تو میندیش زغونائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رنق سگاں را

ہمیں اس شعر سے نسلی عصبیت اور جانبداری کی بو آتی ہے۔ کتے اگر شعر کہہ سکتے تو دوسرا مصرع کچھ یوں ہوتا۔ ”آواز گدا کم نہ کند رنق سگاں را“
کچھ دن بعد ان کا لنگڑا دشمن یعنی پہلوان سینھ دکان بڑھا کر کہیں اور چلا گیا۔ قبلہ بات بے بات ہر ایک کو دھمکی دینے لگے کہ سالے کو بلی پہ لٹکا دوں گا۔ ہیبت کا یہ عالم کہ اشارہ تو بہت بعد کی بات ہے، قبلہ جس گاہک کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھ لیں، اسے کوئی دوسرا نہیں بلاتا تھا۔ اگر وہ از خود دوسری دکان میں چلا بھی جائے تو دکاندار اسے لکڑی نہیں دکھاتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سڑک پر یوں ہی کوئی راہ گیر

منہ اٹھائے جا رہا تھا کہ قبلہ نے اسے انگلی سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جس دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا تھا، اس کا مالک اور منیم اسے گھسیٹتے ہوئے قبلہ کی دکان میں اندر دھکیل گئے۔ اس نے قبلہ سے روبانسا ہو کر کہا کہ میں تو مول گنج پتنگوں کے بیچ دیکھنے جا رہا تھا۔

○ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں

پھر یکایک ان کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ وہ کٹر مسلم لیگی تھے۔ اس کا اثر ان کی بزنس پر پڑا۔ پھر پاکستان بن گیا۔ انہوں نے اپنے نعرے کو حقیقت بننے دیکھا۔ اور دونوں کی پوری قیمت ادا کی۔ گاہکوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ نکلز منڈی کے چوہے شیر ہو گئے۔ عزیز و اقارب جن سے وہ تمام عمر لڑتے جھگڑتے اور نفرت کرتے رہے، ایک ایک کر کے پاکستان چلے گئے تو ایک جھٹکے کے ساتھ یہ انکشاف ہوا کہ وہ ان نفرتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور جب اکلوتی بیٹی اور داماد بھی اپنی دکان بیچ کھوچ کے کراچی سدھارے تو انہوں نے بھی اپنے خیمے کی طنائیں کاٹ ڈالیں۔ دکان اونے پونے ایک دلال کے ہاتھ بیچی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ”بے نامی“ سودا ہے۔ دلال کی آڑ میں دکان دراصل اسی نکلزے پہلوان سیٹھ نے خرید کر ان کی ناک کاٹی ہے۔ خفیف سا شبہ تو قبلہ کو بھی ہوا تھا، مگر ”اپنی بلا سے بوم بے یا ہما رہے“ والی صورت حال تھی۔ ایک ہی جھٹکے میں بیڑھیوں کے رشتے ناتے ٹوٹ گئے اور قبلہ نے پرکھوں کی جنم بھوم چھوڑ کر ان کے خوابوں کی سرزمین کا رخ کیا۔

ساری عمر شیش محل میں اپنی مور پنکھ انا کا ناچ دیکھتے دیکھتے، قبلہ ہجرت کر کے کراچی آئے تو نہ صرف زمین اجنبی لگی، بلکہ اپنے پیروں پر نظر پڑی تو وہ بھی کسی اور کے لگے۔ کھولنے کو تولی مارکیٹ میں ہرچند رائے روڈ پر شتم شتم دکان کھول لی، مگر بات

نہیں بنی۔ گجراتی میں مثل ہے کہ پرانے مٹکے پر نیا منہ نہیں چڑھایا جاسکتا۔ آنے کو تو وہ ایک نئی سرسبز زمین میں آ گئے، مگر ان کی بوڑھی آنکھیں پلکھن کو ڈھونڈتی رہیں۔ پلکھن تو درکنار انہیں تو کراچی میں نیم تک نظر نہ آیا۔ لوگ جسے نیم بتاتے تھے وہ دراصل بکائن تھی جس کی نبولی کو لکھنؤ میں حکیم صاحب عالم، پیپش اور بوایر کے نسخوں میں لکھا کرتے تھے۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں
 کہاں کانپور کے دیہاتی گاؤں، کہاں کراچی کے غریب ساگوان
 خریدنے والے، درحقیقت انہیں جس بات سے سب سے زیادہ
 تکلیف ہوئی وہ یہ تھی کہ یہاں اپنے قرب و جوار میں
 یعنی اپنے سایہ زمت میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا
 جسے وہ وجہ و بے خطر گالی دے سکیں۔ ایک دن کہنے لگے
 ”یہاں تو بڑھئی آری کا کام زبان سے لیتا ہے۔ چار پانچ
 دن ہوئے۔ ایک دریدہ دہن بڑھئی آیا۔ اقبال مسیح نام تھا۔
 میں نے کہا، اے پرے ہٹ کر کھڑا ہو۔ کہنے لگا، حضرت
 عیسیٰ بھی تو ترکھان تھے۔ میں نے کہا، کیا کفر بکتا ہے؟
 ابھی ملی پہ لٹکا دوں گا۔ کہنے لگا، وہ لوگ وی ایسی کہندے
 سں“ (وہ لوگ بھی حضرت عیسیٰ سے یہی کہتے تھے)

○ میر تقی میر کراچی میں

پہلی نظر میں انہوں نے کراچی کو اور کراچی نے ان کو مسترد کر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے کراچی
 میں کیڑے ڈالتے۔ شکایت کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا۔
 ”حضرت“ یہ چمچر ہیں یا مگر چمچ۔ کراچی کا چمچر ڈی ڈی ٹی سے بھی نہیں مرتا۔ صرف

قوالوں کی تالیوں سے مرتا ہے۔ یا غلطی سے کسی شاعر کو کٹ لے تو باؤلا ہو کر بے اولادا مرتا ہے۔ نمرود مردود کی موت ناک میں مچھر گھسنے سے واقع ہوئی تھی۔ کراچی کے مچھروں کا شجرۂ نسب کئی نمرودوں کے واسطے سے اس مچھر سے جاملتا ہے۔ اور ذرا زبان تو ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے پہلی مرتبہ ایک صاحب کو پٹے والے کو پکارتے سنا تو میں سمجھا اپنے کتے کو بلا رہے ہیں۔ معلوم ہوا یہاں چپراسی کو پٹے والا کہتے ہیں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ پھٹا اور لفرا ہوتا رہتا ہے۔ نوکو تو کہتے ہیں، اردو میں اس صورت حال کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ بھائی میرے، اردو میں یہ صورت حال بھی تو نہیں ہے۔ بمبئی والے لفظ اور صورت حال دونوں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ میر تقی میر اونٹ گاڑی میں منہ باندھے بیٹھے رہے۔ اپنے ہم سفر سے اس لیے بات نہ کی کہ ”زبان غیر سے اپنی زباں بگڑتی ہے“ میر صاحب کراچی میں ہوتے تو بخدا ساری عمر منہ پر ڈھانٹا باندھے پھرتے، یہاں تک کہ ڈاکوؤں کا سا بھیس بنائے پھرنے پر کسی ڈکیتی میں دھر لیے جاتے۔ اماں، ٹونک والوں کو امرود کو صفری کہتے تو ہم نے بھی سنا تھا۔ یہاں امرود کو جام کہتے ہیں۔ اور اس پر نمک مرچ کے بجائے ”صاحب“ لگا دیں تو مراد نواب صاحب لسیلہ ہوتے ہیں۔ اپنی طرف وکٹوریہ کا مطلب ملکہ ٹوریہ ہوتا تھا۔ یہاں کسی ترکیب سے دس بارہ جنے ایک گھوڑے پر سواری گانٹھ لیں تو اسے وکٹوریہ کہتے ہیں۔ میں دو دن لاہور رکھا تھا۔ وہاں دیکھا کہ جس بازار میں کونکوں سے منہ کالا کیا جاتا ہے، وہ ہیرا منڈی کہلاتی ہے۔ اب یہاں نیا فیشن چل پڑا ہے۔ گانے والے کو گلوکار اور لکھنے والے کو قلم کار کہنے لگے ہیں۔ میاں، ہمارے وقتوں میں تو صرف نیکو کار اور بدکار ہوا کرتے تھے۔ قلم اور گلے سے یہ کام نہیں لیا جاتا تھا۔

”میں نے لالو کھیت، بہار کالونی، چاکی واٹھ اور گولیہار کا چپہ چپہ دیکھا ہے۔ چودہ پندرہ لاکھ آدمی (اخبار والے اب آدمی کہنے سے شرماتے ہیں۔ افراد اور نفوس کہتے ہیں) ضرور رہتے ہوں گے۔ لیکن کہیں کتابوں اور عطریات کی دکان نہ دیکھی۔ کافذ تک کے پھول نظر نہ آئے۔ کانپور میں ہم جیسے شرفاء کے گھروں میں کہیں نہ کہیں موتیا کی نیل

ضرور چڑھی ہوتی تھی۔ حضور والا، یہاں موتیا صرف آنکھوں میں اترتا ہے۔ حد ہو گئی، کراچی میں لکھ پٹی، کروڑ پتی، سیٹھ لکڑی اس طرح نپوتا ہے گویا کم خواب کا پارچہ خرید رہا ہے۔ لکڑی دن میں دو فٹ بکتی ہے اور برادہ خریدنے والے پچاس۔ میں نے برسوں اپلوں پر پکایا ہوا کھانا بھی کھایا ہے۔ لیکن برادے کی انگلیٹھی پر جو کھانا چکے گا وہ صرف دوزخی مردوں کے چالیسویں کے لیے مناسب ہے۔

”بھر پائے ایسی بزنس سے! مانا کہ روپیہ بہت کچھ ہوتا ہے، مگر بھی کچھ تو نہیں۔ زر کو حاجت روا کرنے والا، قاضی الحاجات کہا گیا ہے۔ تسلیم، مگر جب یہ خود سب سے بڑی حاجت بن جائے تو وہ صرف موت سے رفع ہو گی۔ میں نے تو زندگی میں ایسی کافی کھتری لکڑی نہیں نیچی۔ نہ فروختی، نہ سوختی۔ بڑھئی کی یہ مجال کہ چھاتی پہ چڑھ کے کمیشن مانگے۔ نہ دو تو مال کو گندے انڈے کی طرح قیامت تک بیٹے رہو۔ ہائے! نہ ہوا کانپور، بولے سے سالے کی ناک اتار کر ہتھیلی پر رکھ دیتا کہ جا اپنی جروا کو دین مر میں دے دینا۔ واللہ یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سنتا ہوں یہاں کے بازار حسن نیپیر روڈ اور جلاپانی روڈ پر شب زائیاں اپنے اپنے درشن درپچوں میں لال بٹیاں جلتے ہی خنجراب چھاتیوں کے خوانچے لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ فلموں میں بھی اشرف المعلقات ہی کی نمائش ہوتی ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ اوچھے کے گھر تیتڑ، باہر باندھوں کہ بھیتر۔ جمہوریہ اسلامیہ کی سرکار بے سروکار کچھ نہیں کہتی۔ لیکن کسی طوائف کو شادی بیاہ میں بھرے کے لیے بلانا ہو تو پہلے اس کی اطلاع تھانہ متعلقہ کو دینی پڑتی ہے، رندئی کو پرمٹ، راشن کارڈ پہ ملتے ہم نے یہیں دیکھا۔ نقد عیش عندالطلب نہ ملا تو کس کام کا۔ درشنی منڈیوں میں درشنی ہنڈیوں کا کیا کام۔“

مرزا عبدالودود بیگ اس صورت حال کی کچھ اور ہی تاویل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طوائف کو تھانے سے NOC اس لیے لینا پڑتا ہے کہ پولیس پوری طرح اطمینان کر لے کہ وہ اپنے دھندے پر ہی جا رہی ہے۔ وعظ سننے یا سیاست میں حصہ لینے نہیں جا رہی۔

ایک دن قبلہ فرمانے لگے۔ ”ابھی کچھ دن ہوئے“ کراچی کی ایک نامی گرامی طوائف کا گانا سننے کا اتفاق ہوا۔ اماں، اس کا تلفظ تو چال چلن سے بھی زیادہ خراب نکلا۔ ہائے، ایک زمانہ تھا کہ شرفاء اپنے بچوں کو ادب آداب سیکھنے کے لیے چوک کی طوائفوں کے کوٹھوں پر بھیجتے تھے۔“

اس باب میں بھی مرزا سوء ظن سے کام لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طوائفوں کے کوٹھوں پر تو اس لیے بھیجتے تھے کہ بزرگوں کی صحبت اور گھر کے ماحول سے بچے رہیں۔

○ دوڑتا ہوا درخت

کراچی شہر انہیں کسی طور اور کسی طرف سے اچھا نہیں لگا۔ جھنجھلا کر بار بار کہتے۔ ”اماں“ یہ شہر ہے یا جہنم؟“ مرزا کسی دانا کے قول میں تصرف بے جا کر کے فرماتے ہیں کہ قبلہ اس دارالمحن سے کوچ فرمانے کے بعد اگر خدا نخواستہ وہیں پہنچ گئے جس سے کراچی کو تشبیہ دیا کرتے تھے تو چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد یہی ارشاد ہو گا کہ ہم نے تو سوچا تھا کراچی چھوٹا سا جہنم ہے۔ جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا۔

ایک دفعہ ان کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے کہا کہ ”تمہیں معاشرے میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں تو میٹھے میٹھے ان پر کڑھنے کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرو۔“

ارشاد فرمایا۔ ”سنو“ میں نے ایک زمانے میں پی ڈبلیو ڈی کے کام بھی کئے ہیں مگر دونوں کی ایئر کنڈیشننگ کا ٹھیکہ نہیں لے سکتا۔“

بات صرف اتنی تھی کہ اپنی چھاپ، تلک اور چھب چھوانے سے پہلے وہ جس آئینے میں خود کو دیکھ دیکھ کر ساری عمر اترایا کئے، اس میں جب نئی دنیا اور نئے وطن کو دیکھا تو وہ امتداد زمانہ سے Distorting Mirror (مسخائیند) بن چکا تھا جس میں ہر شکل اپنا ہی منہ چڑاتی نظر آتی تھی۔

ان کے کاروباری حالات تیزی سے گبڑ رہے تھے۔ بزنس نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان کی دکان کی دیوار پر ایک تانہ وصلی آویزاں دیکھ کر ہمیں بڑا دکھ ہوا۔

نہ پوچھ حال مرا، چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

ہم نے ان کا دل بڑھانے کے لیے کہا، آپ کو چوب خشک کون کہہ سکتا ہے؟ آپ کی جواں ہمتی اور مستعدی پر ہمیں تو رشک آتا ہے۔ خلاف معمول مسکرائے۔ جب سے ڈینچرز ٹوٹے، منہ پہ رومال رکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ کہنے لگے ”ہاں میاں! آپ جواں آدمی ہیں۔ اپنا تو یہ حال ہوا کہ

”منفعل“ ہو گئے قوی غالب
اب عناصر میں ”اجڑال“ کہاں

پھر منہ سے رومال ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”برخوردارا میں وہ درخت ہوں جو ٹرین میں جاتے ہوئے مسافر کو دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔“

○ میرے ہی منہ کا مجھ پر دھوا

یوں وہ حتی الامکان اپنے غصے کو کم نہیں ہونے دیتے تھے۔ کہتے تھے، میں ایسی جگہ ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتا جہاں آدمی کسی پر غصہ ہی نہ ہو سکے۔ اور جب انہیں ایسی ہی جگہ رہنا پڑا تو وہ زندگی میں پہلی بار اپنے آپ سے روٹھے۔ اب وہ آپ ہی آپ کڑھتے، اندر ہی اندر کھولتے، سلگتے رہتے۔

میرے ہی من کا مجھ پر دھاوا
میں ہی اگنی میں ہی ایندھن

Urdu4U.com

انہی کا قول ہے کہ یاد رکھو، غصہ جتنا کم ہو گا، اس کی جگہ اداسی لیتی چلی جائے گی۔ اور یہ بڑی بزدلی کی بات ہے۔ بزدلی کے ایسے ہی اداس لمحوں میں اب انہیں اپنا آبائی گاؤں جہاں بچپن گزرا تھا، بے تحاشا یاد آنے لگتا۔ واماندگی زیست نے ماضی میں اپنی پناہیں تراش لیں۔ گویا اہم کھل گیا۔ دھندلاتے سپیا رنگ کی تصویریں چشم تصور کے سامنے بکھرتی چلی جاتیں۔ ہر تصویر کے ساتھ زمانے کا ورق الٹا چلا گیا۔ ہر اسنیپ شاٹ کی اپنی ایک کہانی تھی۔ دھوپ میں ابرق کے ذروں سے جلتی کچی سڑک پر گھوڑوں کے پسینے کی نر مہکار۔ بھیڑ کے نوزائیدہ بچے کو گلے میں مفلر کی طرح ڈالے شام کو خوش خوش لوٹتے کسان۔ چلمنوں کے پیچھے ہار سنگھار کے پھولوں سے رنگے ہوئے دوپٹے۔ ارہر کے ہرے بھرے کھیت میں پگڈنڈی کی مانگ۔ خشک سالی میں ساون کے تھوٹھے بادلوں کو بہہ بہہ کر نکلتی نر آس آنکھیں۔ جاڑے کی اجاڑ راتوں میں ٹھٹھرتے گیدڑوں کی منحوس آوازیں۔ چراغ جلے باڑے میں لوٹی گایوں کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں۔ کالی بھنور رات میں چوپال کی جلتی بجھتی شستی چلم پر طویل سے طویل تر ہوتے ہوئے کش۔ موتیا کے گجروں کی لپٹ کے ساتھ کنوارے پنڈے کی بگولا مہکار۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں تانہ قبر پر جلتی اگر بتی کا بل کھاتا دھواں۔ دہکتی بالو میں تڑختے چنوں کی سوندھی لپٹ میں پھڑکتے ہوئے نتھنے۔ میونسپلٹی کی مٹی کے تیل کی لالین کا بہہہکا۔ یہ تھی ان کے گاؤں کی ست سنگد۔ یہ ان کے اپنے نافہ ماضی کی مہکار تھی جو یادوں کے دشت میں دوانی پھرتی تھی۔

ستر سالہ بچے کے ذہن میں تصویریں گڈ مڈ ہونے لگتیں۔ خوشبوئیں، نرمائیں اور آوازیں بھی تصویر بن بن کر ابھرتیں۔ اسے اپنے گاؤں میں مینہ برسنے کی ایک ایک آواز الگ سنائی دیتی۔ ٹین کی چھت پر تڑ تڑ بجتے ہوئے تاشے۔ سوکھے پتوں پر کراڑی بوندوں کا شور۔ کچے فرش پر جہاں انگل بھر پانی کھڑا ہو جاتا، وہاں موٹی بوند گرتی تو ایک موتیوں کا تاج سا ہوا میں اچھل پڑتا۔ تپتی کھیریلوں پر اڑتی بدلی کے جھالے کی سنناہٹ۔ گرمی دانوں سے اڑے بالک بدن پر برکھا کی پہلی پھوار، جیسے کسی نے منتھول میں نہلا دیا ہو۔ جوان بیٹے کی قبر پر پہلی بارش اور ماں کا ننگے سر آگن میں آ آ کر آسمان کی طرف دیکھنا۔ پھبک اٹھنے کے لیے تیار مٹی پر ٹوٹ کے برسنے والے بادل کی ہراول گرم لپٹ۔ ڈھولک پر ساون کے گیت کی تال پر بھتی چوٹیاں اور بے تال قہقہے۔ سوکھے تالاب کے پیندے کی چکنی مٹی میں پڑی ہوئی دراڑوں کے لوازمات جال میں ترسا ترسا کر برسنے والی بارش کے سرسراتے ریلے۔ تھوئی سے لٹکی ہوئی لائین کے سامنے، تاحد روشنی، موتیوں کی رم جھم جھار، ہمک ہمک کر پرائے آگن میں گرتے پرٹالے۔ آموں کے پتوں پر مجھے بجاتی نرسل بوچھاڑ۔ اور جھولوں پر پتلیں لیتی دوشیزائیں۔

اور پھر رات کے سناٹے میں، پانی تھمنے کے بعد، سوتے جاگتے میں، اولتی کی ٹپا ٹپ۔ اولتی کی ٹپا ٹپ تک پہنچتے پہنچتے قبلہ کی آنکھیں جل تھل ہو جاتیں۔ بارش تو ہم انہیں اپنے لاہور میں نہتیا گلی کی ایسی دکھا سکتے تھے کہ عمر رفتہ کی ساری ٹپا ٹپ بھول جاتے۔ پر اولتی کہاں سے لاتے؟ اسی طرح آم تو ہم ملتان کا ایک سے ایک پیش کر سکتے تھے۔ دوسری، لنگڑا، ثمر بہشت، انور رنول۔ لیکن ہمارے پنجاب میں تو ایسے درخت ناپید ہیں جن میں آموں کے بجائے دوشیزائیں لٹکی ہوئی ہوں۔

چنانچہ ایسے نازک موقعوں پر ہم خاموش، ہمہ تن گوش بلکہ خرگوش بنے اولتی کی ٹپا ٹپ سنتے رہتے۔

○ قبلہ کا ریڈیو اونچا سنتا تھا

دیا کے بہاؤ کے خلاف تیرنے میں تو خیر کوئی نقصان نہیں۔ ہمارا مطلب ہے، دیا کا نقصان نہیں۔ لیکن قبلہ تو سینکڑوں فٹ کی بلندی سے گرتے ہوئے آبشار نیاگرا پر تیر کر چڑھنا چاہتے تھے۔ یا یوں کہئے کہ تمام عمر نیچے اترنے والے ایس کے لیٹر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے رہے اور ایس کے لیٹر بنانے والے کو گالیاں دیتے رہے۔ ایک دن کہنے لگے۔ ”مشتاق میاں یہ تمہارا کراچی بھی عجب مردم ناشناس شہر ہے۔ نہ خریداری کی تمیز، نہ خوردی کے آداب۔ نہ کسی کی بزرگی کا لحاظ ملاحظہ۔ میں جس زمانے میں بشارت میاں کے ساتھ بہار کالونی میں رہتا تھا۔ ایک بیٹری سے چلنے والا ریڈیو خرید لیا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو میں کار کی بیٹری لگانی پڑتی تھی۔ بہار کالونی میں بجلی نہیں تھی۔ اس کا رکھنا اور چلانا ایک درد سر تھا۔ بشارت میاں روزانہ بیٹری اپنے کارخانے لے جاتے اور چارج ہونے کے لیے آراء مشین میں لگا دیتے۔ سات آٹھ گھنٹے میں اتنی چارج ہو جاتی کہ بس ایک آدھ گھنٹے بی بی سی سن لیتا تھا۔ اس کے بعد ریڈیو سے آراء مشین کی آوازیں آنے لگتیں اور میں اٹھ کر چلا آتا۔ گھر کے پچھواڑے ایک پچیس فٹ اونچی نہایت قیمتی، بے گانٹھ بلی گاڑ کر ایریل لگا رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ ریڈیو اونچا سنتا تھا۔ آئے دن پتنگ اڑانے والے لونڈے میرے ایریل سے بچ لڑاتے۔ مطلب یہ کہ اس میں پتنگ الجھا کر زور آزمائی کرتے۔ ڈور ٹوٹ جاتی، ایریل خراب ہو جاتا۔ ارے صاحب، ایریل کیا تھا، پتنگوں کا فضائی قبرستان تھا۔ اس پر یہ کئی چنگلیں چوبیس گھنٹے اس طرح پھڑپھڑاتی رہتیں جیسے سڑک کے کنارے کسی نوفتیدہ پیر کے مزار پر جھنڈیاں۔ پچیس فٹ کی اونچائی پر چڑھ کر ایریل دوبارہ لگانا۔ نہ پوچھئے کیسا عذاب تھا۔ بس یوں سمجھئے سولی پہ لٹک کے بی بی سی سنتا تھا۔ بہر حال جب برنس روڈ کے فلیٹ میں منتقل ہونے لگا تو سوچا، وہاں تو بجلی ہے۔ چلو ریڈیو بیچتے چلیں۔ بشارت میاں بھی عاجز آ گئے

تھے۔ کہتے تھے اس سے تو پٹنگوں کی پھڑپھڑاہٹ براڈ کاسٹ ہوتی رہتی ہے۔ ایک دور کے پڑوسی سے ۲۵۰ روپے میں سودا پکا ہو گیا۔ علی الصبح وہ نقد رقم لے آیا اور میں نے ریڈیو اس کے حوالے کر دیا۔ رات کو گیارہ بجے پچانک بند کرنے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ شخص اور اس کے نیل جیسی گردن والے دو بیٹے کدال پھاؤڑا لیے مزے سے ایریل کی بلی اکھاڑ رہے ہیں۔ میں نے ڈپٹ کر پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ سینہ زوری دیکھیے! کہتے ہیں بڑے میاں! بلی اکھاڑ رہے ہیں ہماری ہے۔

”ڈھائی سو روپے میں ریڈیو بیچا ہے بلی سے کیا تعلق“

”تعلق نہیں تو ہمارے ساتھ چلو اور ذرا بلی کے بغیر بجا کے دکھا دو۔ یہ تو اس کی Accessory ہے۔“

”نہ ہوا کانپور“ سالے کی زبان گدی سے کھینچ لیتا۔ اور ان حرامی پلوں کی نیل جیسی گردن ایک ہی وار میں بھٹا سی اڑا دیتا۔ میں نے تو زندگی میں ایسا بد معاملہ بے ایمان آدمی نہیں دیکھا۔ اس اثناء میں وہ نابکار بلی اکھاڑ کے زمین پر لٹال چکا تھا۔ ایک دفعہ جی میں تو آئی کہ اندر جا کر ۱۲ بور لے آؤں اور اسے بھی بلی کے برابر لمبا لٹال دوں۔ پھر خیال آیا کہ بندوق کا لائسنس تو ختم ہو چکا ہے۔ اور کینے کے منہ کیا لگتا۔ اس کی بے قصور بیوی رانڈ ہو جائے گی۔ وہ زیادہ قانون چھانٹنے لگا تو میں نے کہا جا جا! تو کیا سمجھتا ہے؟ بلی کی حقیقت کیا ہے۔ یہ دیکھ یہ چھوڑ کے آئے ہیں۔“

قبلہ حویلی کی تصویر دکھاتے ہی رہ گئے اور وہ تینوں بلی اٹھا کر لے گئے۔

○ معذور بیوی اور گشتی چلم

ان کی زندگی کا ایک پہلو ایسا تھا جس کا کسی نے ان کا اشارنا بھی ذکر کرتے نہیں سنا۔ ہم اس کی طرف ابتدائی حصے میں اشارہ کر چکے ہیں۔ ان کی شادی بڑے چاؤ چونچلے

سے ہوئی تھی۔ بیوی بہت خوبصورت، نیک طینت اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ شادی کے چند سال بعد ایک ایسا مرض لاحق ہوا کہ پہنچوں تک دونوں ہاتھوں سے معذور ہو گئیں۔ قریبی اعزہ بھی ملنے سے گریز کرنے لگے۔ روزمرہ کی ملاقاتیں، شادی عقی میں شرکت، بھی سلسلے رفتہ رفتہ منقطع ہو گئے۔ گھر کا سارا کام نوکر اور مائیں تو نہیں کر سکتیں۔ قبلہ نے جس محبت اور دل سوزی سے تمام عمر بے عذر خدمت اور دیکھ رکھ کی، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی چوٹی بے گندھی اور دوپٹے بے چنا ہو۔ یا جمعہ کو کاسنی رنگ کا نہ ہو۔ سال گزرتے چلے گئے۔ وقت نے سر پر کاسنی دوپٹے کے نیچے روئی کے گلے جما دیئے۔ مگر ان کی توجہ اور پیار میں ذرا جو فرق آیا ہو۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ایثار و رفاقت کا یہ پیکر وہی مغلوب الغضب آدمی ہے جو گھر کے باہر ایک چلتی ہوئی تلوار ہے۔ زندگی بھر کا ساتھ ہو تو صبر اور سہاد کی آزمائش کے ہزار مرحلے آتے ہیں۔ انہوں نے اس معذور بی بی سے کبھی اونچی آواز میں بھی بات نہیں کی۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کی جھلہٹ اور غیظ و غضب کی ابتدا اسی سانحہ معذوری سے ہوئی۔ وہ بی بی تو مصلیٰ پر ایسی بیٹھیں کہ دنیا ہی میں جنت مل گئی۔ قبلہ کو نماز پڑھتے کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن زندگی بھر جیسی سچی محبت اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر جیسی بے عذر اور خاموش خدمت انہوں نے چالیس برس تک کی وہی ان کی عبادت و ریاضت، وہی ان کا درد و غم اور وہی ان کی دعائے نیم شبی تھی۔ وہ بڑا بخشن ہار ہے۔ شاید یہی ان کا وسیلہ بخشائش بن جائے۔

ایک دور ایسا بھی آیا کہ بیوی سے ان کی پریشانی نہ دیکھی گئی۔ خود کہا، کسی رانڈ بیوہ سے شادی کر لو۔ بولے، ہاں بھاگوان! کریں گے۔ کہیں دو گز زمین کا ایک ٹکڑا ہے جو نہ جانے کب سے ہماری برات کی راہ دیکھ رہا ہے۔ وہیں چار کاندھوں پہ ڈولا اترے گا۔ بیوی! مٹی سدا ساگن ہے۔ سو جائیں گے اک روز زمیں اوڑھ کے ہم بھی۔

بیوی کی آنکھ میں آنسو دیکھے تو بات کا رخ پھیر دیا۔ وہ اپنی ساری، امجری، لکڑی، حقے اور تمباکو سے کشید کرتے تھے۔ بولے، بیوی! یہ راند بیوہ کی قید تم نے کیا سوچ کے لگائی؟ مانا کہ شیخ سعدی کہہ گئے ہیں ”زن بیوہ مکن اگرچہ حور است۔“ مگر تم نے شاید وہ پوبہی مثل نہیں سنی۔ پہلے پیوے بھکوا، پھر پیوے تمکوا۔ پیچھے پیوے چلم چاٹ۔ یعنی جو شخص پہلے حقہ پیتا ہے وہ بدھو ہے کہ واصل وہ تو چلم سلگانے اور تاؤ پر لانے میں ہی جٹا رہتا ہے۔ تمباکو کا اصل مزہ تو دوسرے شخص کے حصے میں آتا ہے اور جو آخر میں پیتا ہے وہ جلے ہوئے تمباکو سے خالی بھک بھک کرتا ہے۔

○ جدھر جائیں دکتے جائیں

کراچی میں دکان تو پھر بھی تھوڑی بہت چلی، مگر قبلہ بالکل نہیں چلے۔ زمانے کے تغیر اور گردش پر کس کا زور چلا ہے جو ان کا چلتا۔ حوادث کو روکا نہیں جا سکتا۔ ہاں، تہذیب و اس سے حوادث کا زور توڑا جا سکتا ہے۔ شخصیت میں چیخ پڑ جائیں تو دوسروں کے علاوہ خود کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ نکلنے لگیں تو اور زیادہ اذیت ہوتی ہے۔ کراچی ہجرت کرنے کے بعد اکثر فرماتے کہ ڈیڑھ سال جیل میں رہ کر جو تبدیلی مجھ میں نہ آئی، وہ یہاں ایک ہفتے میں آگئی۔ یہاں تو برنس کرنا ایسا ہے جیسے سنگھاڑے کے تالاب میں تیرنا۔ کانپور ہی کے چھٹے ہوئے چھاکے یہاں شیر بنے دندناتے پھرتے ہیں۔ اور اچھے اچھے شرفاء ہیں کہ گیدڑ کی طرح دم کنوا کے بھٹ میں جا بیٹھے۔ ایسا بھوگ پڑا کہ ”خود بخود بل میں ہے ہر شخص سلما جاتا“ جو دانا ہیں وہ اپنی دامن چھپائے بلوں میں گھسے بیٹھے ہیں۔ باہر نکلنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اس پر مرزا نے ہمارے کان میں کہا۔

انہیں ”دم“ کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ

ایک دوست نے اپنی آبرو جو کھم میں ڈال کر قبلہ سے کہا کہ گزرا ہوا زمانہ لوٹ کر نہیں آ سکتا۔ حالات بدل گئے ہیں۔ آپ بھی خود کو بدلے۔ مسکرائے۔ فرمایا 'خربو نہ خود کو گول کر لے تب بھی تربوز نہیں بن سکتا۔'

بات دراصل یہ تھی کہ زمانے کا رخ پچاننے کی صلاحیت 'علم و بردباری' نرمی اور لچک نہ ان کی سرشت میں تھی 'اور نہ زمیندارانہ ماحول اور معاشرے میں ان کا شمار خویوں میں ہوتا تھا۔ سختی 'خود رائی' 'تمکنت' خشونت اور جلالی مزاج عیب نہیں 'بلکہ فیوڈل کردار کی راستی اور مضبوطی کی دلیل تصور کئے جاتے تھے اور زمیندار تو ایک طرف رہے 'اس زمانے کے علماء تک ان اوصاف پر فخر کرتے تھے۔

ہم نہ نکلت ہیں ' نہ گل ہیں جو مہکتے جاویں
آگ کی طرح جدھر جاویں دہکتے جاویں

قبلہ کے حالات تیزی سے گبڑنے لگے تو ان کے بھی خواہ میاں انعام الہی نے جو اپنی خوردی کے باوصف ان کے مزاج اور معاملات میں درخور رکھتے تھے 'عرض کیا کہ دکان ختم کر کے ایک بس خرید لیجئے۔ گھر بیٹھے آمدنی کا وسیلہ ہے۔ روٹ پر مٹ میرا ذمہ۔ آج کل اس دھندے میں بڑی چاندی ہے۔ یکبارگی جلال آ گیا۔ فرمایا 'چاندی تو طبلہ سارنگی بجانے میں بھی ہے۔ ایک وضع داری کی ریت بزرگوں سے چلی آ رہی ہے ' جس کا تقاضا ہے کہ خراب و خوار ہی ہونا مقدر میں لکھا ہے تو اپنے آبائی اور آزمودہ طریقے سے ہوں گے۔ بندہ ایسی چاندی پر لات مارتا ہے۔

چرخ اب ہمیں جو دے ہے، نہیں لیتے ہم
 کوئین بھی گھو دے ہے، نہیں لیتے ہم
 ہم لیتے ہیں جس ڈھب سے، نہیں دیتا وہ
 جس ڈھب سے کہ وہ دے ہے، نہیں لیتے ہم

○ آخری گالی

کاروبار مندا بلکہ بالکل ٹھنڈا۔ طبیعت زنگ رنگ۔ بے دلی کے عالم میں دن گزر رہے تھے۔
 دکانداری اب ان کی مالی نہیں، نفسیاتی ضرورت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دکان
 بند کر دی تو گھر میں پڑے کیا کریں گے۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ ان کا نیا پٹھان
 ملازم زریں گل خان کئی گھنٹے دیر سے آیا۔ ہر چند غصے کو پینے کی کوشش کرتے،
 لیکن پرانی عادت کہیں جاتی ہے۔ چند ماہ قبل انہوں نے ایک ساٹھ سالہ منشی آدھی تنخواہ
 پر رکھا تھا، جو گیسوے رنگ کا ڈھیلا ڈھالہ جبہ پہنے ننگے پیر زمین پر آلتی پالتی مارے
 حساب کتاب کرتا تھا۔ کرسی یا کسی بھی اونچی چیز پر بیٹھنا اس کے مسلک میں منع تھا۔
 وارثی سلسلے کے کسی بزرگ سے بیعت تھا۔ فرض شناس، ایماندار، پابند صوم و صلوٰہ، زود
 رنج، کام میں چوہٹ۔ قبلہ نے طیش میں آ کر ایک دن اسے حرام خور کہہ دیا۔ سفید
 واڑھی کا لحاظ بھی نہ کیا۔ اس نے رسالہ سے کہا ”بجاء حضور کے ہاں جو شے وافر
 ملتی ہے وہی تو فقیر کھائے گا۔ السلام علیکم۔“ یہ جا وہ جا۔ دوسرے دن سے منشی جی نے
 نوکری پر آنا اور قبلہ نے حرام خور کہنا چھوڑ دیا۔ لیکن حرام خور کے علاوہ اور بھی تو
 دل دکھانے والے بہترے لفظ ہیں۔ زریں گل خان کو سخت ست کہتے کہتے ان کے منہ
 سے روانی اور سرگرائی میں وہی گالی نکل گئی جو اچھے دنوں میں ان کا تکیہ کلام ہوا
 کرتی تھی۔ گالی کی بھیانک گونج درءِ آدم خیل کے پہاڑوں تک ٹھنٹھناتی پہنچی جہاں زریں

گل کی بیوہ ماں رہتی تھی۔ وہ چھ سال کا تھا جب ماں نے بیوگی کی چادر اوڑھی تھی۔ بارہ سال کا ہوا تو اس نے وعدہ کیا تھا کہ ماں! میں بڑا ہو جاؤں تو کراچی میں نوکری کر کے تجھے پہلی تنخواہ سے بغیر پیوند کی چادر بھیجوں گا۔ اسے آج تک کسی نے یہ گالی نہیں دی تھی۔ جوان خون، غصیلہ مزاج۔ پٹھان کی غیرت اور پختو کا سوال تھا۔ زریں گل خان نے ان کی ترچھی ٹوپی اتار کر پھینک دی اور چاقو تان کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ”بڑھے! میرے سامنے سے ہٹ جا، نہیں تو ابھی تیرا پیٹ پھاڑ کے کلیجہ کچا چبا جاؤں گا۔ تیرا پلید مردہ بلی پہ لٹکا دوں گا۔“

ایک گاہک نے بڑھ کر چاقو چھینا۔ بڑھے نے جھک کر زمین سے اپنی مٹلی ٹوپی اٹھائی اور گرد جھاڑے بغیر سر پر رکھ لی۔

○ کون کیسے ٹوٹتا ہے

دس پندرہ منٹ بعد وہ دکان میں تالا ڈال کر گھر چلے آئے اور بیوی سے کہہ دیا، اب ہم دکان نہیں جائیں گے، کچھ دیر بعد محلے کی مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اور وہ دوسرے ہی اللہ اکبر پر وضو کر کے کوئی چالیس سال بعد نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو بیوی دھک سے رہ گئیں کہ خیر تو ہے۔ وہ خود بھی دھک سے رہ گئے۔ اس لیے کہ انہیں دو سورتوں کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ وتر بھی ادھورے چھوڑ کر سلام پھیر لیا کہ یہ تک یاد نہیں آ رہا تھا کہ دعائے قنوت کے ابتدائی الفاظ کیا ہیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آدمی اندر سے ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ اور یوں ٹوٹتا ہے۔ اور جب ٹوٹتا ہے تو اپنوں بیگانوں سے، حد یہ کہ سب سے بڑے دشمن سے بھی صلح کر لیتا ہے۔ یعنی اپنے آپ سے۔ اسی منزل پر بصیرتوں کا نزول ہوتا ہے۔ دانش و بینش کے باب کھلتے ہیں۔

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

Urdu4U.com

ایسے بھی محتاط لوگ ہیں جو پیکار و فشارِ زیست سے بچنے کی خاطر خود کو بے عملی کے حصارِ عافیت میں قید رکھتے ہیں۔ یہ بھاری اور قیمتی پردوں کی طرح لٹکے لٹکے ہی لیر لیر ہو جاتے ہیں۔ کچھ گم صم گھمبیر لوگ اس دیوار کی مانند ترختے ہیں جس کی مہین سی دراڑ جو عمدہ پینٹ یا کسی آرائشی تصویر سے با آسانی چھپ جاتی ہے، اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ نیو اندر ہی اندر کسی صدمے سے زمین میں دھنس رہی ہے۔ بعض لوگ چینی کے برتن کی طرح ٹوٹتے ہیں کہ سالے سے آسانی سے جڑ تو جاتے ہیں مگر بال اور جوڑ پہلے نظر آتا ہے، برتن بعد میں۔ اس کے برعکس کچھ ڈھیٹ اور چیکو لوگ ایسے انٹ مادے کے بنے ہوتے ہیں کہ چیونگ گم کی طرح کتنا ہی چباؤ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتے۔ کھینچنے سے کھینچتے ہیں، چھوڑے سے جاتے ہیں سکر۔ آپ انہیں حقارت سے تھوک دیں تو جوتے سے اس بری طرح چپکتے ہیں کہ چھٹائے سے نہیں چھوٹتے۔ یہ کہ خیال آتا ہے کہ اس سے تو دانتوں تلے ہی بھلے تھے کہ پھول تو لیتے تھے۔ یہ چیونگ گم لوگ خود آدمی نہیں، پر آدم شناس ہیں۔ یہ کامیاب و کامران و کامگار لوگ ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے انسان کو دیکھا، پرکھا اور برتا ہے اور جب اسے کھوٹا پایا تو خود بھی کھوٹے ہو گئے۔ وقت کی اٹھتی موج نے اپنے حباب کا تاج ان کے سر پر رکھا اور ساعت گزراں نے اپنے تخت رواں پہ بٹھایا۔

اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ کار کے ونڈا سکرین کی مانند ہوتے ہیں۔ ثابت و سالم ہیں تو سینہ عارف کی طرح شفاف کہ دو عالم کا نظارہ کر لو اور یکایک ٹوٹے تو ایسے ٹوٹے کہ نہ بال پڑا، نہ درکے نہ ترختے۔ یکبارگی ایسے ریزہ ریزہ ہوئے کہ نہ عارف رہا، نہ دو عالم کی جلوہ گری، نہ آئینے کا پتہ کہ کہاں تھا، کدھر گیا، نہ حذر رہا نہ خطر رہا،

جو رہی تو بے خبری رہی۔

اور ایک انا ہے کہ یوں ٹوٹی ہے جیسے جابر سلطانوں کا اقبال، یا حضرت سلیمان کا عصا جس کی ٹیک لگائے وہ کھڑے تھے کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ لیکن ان کا قالب بے جان ایک مدت تک اسی طرح استادہ رہا اور کسی کو شبہ تک نہ گزرا کہ وہ رحلت فرما چکے ہیں۔ وہ اسی طرح بے روح کھڑے رہے اور ان کے اقبال اور رعب و دبدبہ سے کاروبارِ سلطنت حسبِ معمول سابق چلتا رہا۔ ادھر عصا کو دھیرے دھیرے گھن اندر سے کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ چٹاخ سے ٹوٹ گیا اور حضرت سلیمان کا جسدِ خاکی فرشِ زمین پر آ رہا۔ اس وقت ان کی امت اور رعیت پر کھلا کہ وہ دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں۔

سو وہ دیمک زدہ عصائے پندار و جلال جس کے بلِ قبلہ نے بے غل و غش زندگی گزاری، آج شام ٹوٹ گیا اور زیست کرنے کا وہ مظننہ اور ہمہ سرنگوں ہوا۔

○ میں پاپن ایسا جلی کونکہ بھی نہ راکھ

انہیں اس رات نیند نہیں آئی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی کہ نمبر مارکیٹ کا ایک چوکیدار ہانپتا کانپتا آیا اور خبر دی کہ ”صاحب جی! آپ کی دوکان اور گودام میں آگ لگ گئی ہے۔ آگ بجھانے کے انجن تین بجے ہی آ گئے تھے۔ سارا مال کونکہ ہو گیا۔ صاحب جی! آگ کوئی آپ ہی آپ تھوڑی لگتی ہے۔“ وہ جس وقت دوکان پر پہنچے تو سرکاری اصطلاح میں آگ پر قابو پایا جا چکا تھا، جس میں فائر بریگیڈ کی مستعدی اور کارکردگی کے علاوہ اس کو بھی بڑا دخل تھا کہ اب جلنے کے لیے کچھ رہا نہیں تھا۔ شعلوں کی پلپاتی دو شاخہ زبانیں کالی ہو چلی تھیں۔ البتہ چڑ کے تختے ابھی تک دھڑ دھڑ جل رہے تھے۔ اور فضا دور دور تک ان کی تیز خوشبو کے آتشیں آبشار میں نہائی ہوئی تھی۔ مال جتنا تھا سب جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ صرف کونے میں ان کا چھوٹا سا دفتر بچا تھا۔ عرصہ

ہوا، کانپور میں جب لالہ رمیش چندر نے ان سے کہا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں، گودام کی انشورنس پالیسی لے لو تو انہوں نے ملل کے کرتے کی چنی ہوئی آستین الٹ کر اپنے بازو کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ ”یہ رسی یاروں کی انشورنس پالیسی!“ پھر اپنے دفتر پھلا کر رمیش چندر سے کہا ”ذرا چھو کر دیکھو۔“ لالہ جی نے اچنبھے سے کہا۔ ”لوہا ہے لوہا“ بولے۔ ”نہیں، فولاد کہو۔“

دکان کے سامنے خلقت کے ٹھٹ لگے تھے۔ ان کو لوگوں نے اس طرح راستہ دیا جیسے جنازے کو دیتے ہیں۔ ان کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ نہ لب بے سوال پر کوئی لرزش۔ انہوں نے اپنا دفتر کا تالا کھولا۔ انکم ٹیکس کے حسابات اور گوشوارے بغل میں مارے اور گودام کے مغربی حصے میں جہاں چنڑے سے ابھی شعلے اور خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں، تیز تیز قدموں سے گئے۔ پہلے انکم ٹیکس کے کھاتے اور ان کے بعد چابیوں کا گچھا نذر آتش کیا۔ پھر آہستہ آہستہ دائیں بائیں نظر اٹھائے بغیر دوبارہ اپنے دفتر میں داخل ہوئے۔ حویلی کا فوٹو دیوار سے اتارا۔ رومال سے پونچھ کر بغل میں دبایا اور دکان جلتی چھوڑ کر چلے آئے۔

بیوی نے پوچھا۔ ”اب کیا ہوئے گا؟“

انہوں نے سر جھکا لیا۔

اکثر خیال آتا ہے، اگر فرشتے انہیں جنت کی طرف لے گئے جہاں موتیا دھوپ ہو گی اور کاسی بادل، تو وہ باب بہشت پر کچھ سوچ کر ٹھنک جائیں گے۔ رضوان جلد اندر داخل ہونے کا اشارہ کرے گا تو وہ سینہ تانے اس کے قریب جا کر کچھ دکھاتے ہوئے کہیں گے۔

”یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔“

• اسکول ماسٹر کا خواب

○ فیوڈل فینسی

ہر شخص کے ذہن میں عیش و فراغت کا ایک نقشہ ہوتا ہے جو دراصل چربہ ہوتا ہے اس ٹھاٹ باٹ کا جو دوسروں کے حصے میں آیا ہے۔ لیکن جو دکھ آدمی سہتا ہے، وہ تنہا اس کا اپنا ہوتا ہے۔ بلا شرکت غیرے۔ بالکل نجی، بالکل انوکھا۔ ہڈیوں کو پکھلا دینے والی جس آگ سے وہ گزرتا ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ آتش دونخ میں یہ گرمی کہاں۔ جیسا داڑھ کا درد مجھے ہو رہا ہے ویسا کسی اور کو نہ کبھی ہوا، نہ ہو گا۔ اس کے برعکس، ٹھاٹ باٹ کا بلو پرنٹ ہمیشہ دوسروں سے چرایا ہوا ہوتا ہے۔ بشارت کے ذہن میں عیش و تنعم کا جو صد رنگ و ہزار پیوند نقشہ تھا وہ بڑی بوڑھیوں کی اس رنگا رنگ رلی کی مانند تھا جو وہ مختلف رنگ کی کترنوں کو جوڑ جوڑ کر بناتی ہیں۔ اس میں اس وقت کا جاگیردارانہ ظنظنہ اور ٹھاٹ، بگڑے رئیسوں کا تیما اور ٹھسا، مڈل کلاس دکھاوا، قصبائی اترونا پن، ملازمت پیسہ نفاست، سادہ دلی اور ندیدہ پن سب بری طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ انہی کا بیان ہے کہ بچپن میں میری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ خنختی پھینک پھانک، قاعدہ پھاڑ پھوڑ کر مداری بن جاؤں۔ شر شر ڈگڈگی بجاتا، بندر، بھالو جھمورا نچاتا اور ”بچہ لوگ“ سے تالی بجواتا پھروں۔ جب ذرا عقل آئی، مطلب یہ کہ بد اور بدتر کی تمیز پیدا ہوئی تو مداری کی جگہ اسکول ماسٹر نے لے لی۔ اور جب موضع دھیرج گنج میں سچ مچ ماسٹر بن گیا تو میرے نزدیک انتہائے عیاشی یہ تھی کہ مکھن زین کی پتلون، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص، ڈبل کفوں میں سونے کے چھٹانک چھٹانک بھر کے بٹن، نیا سولا ہیٹ جس پر میل خورا غلاف نہ چڑھا ہو اور پیٹنٹ لیڈر کے پمپ شوز پہن کر اسکول جاؤں اور لڑکوں کو صرف اپنی غزلیات پڑھاؤں۔ سفید سلک کی اچکن

جس میں بدری کے کام والے بٹن زرخے تک لگے ہوں۔ جیب میں گنگا جمنی کام کی پانوں کی ڈبیا۔ سر پر سفید کھواب کی رامپوری ٹوپی۔ ترچھی، مگر ذرا شریفانہ زاویے سے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ زے شریف ہی ہو کے رہ جائیں۔ چھوٹی بوٹی کی چکن کا سفید کرتا جو موسم کی رعایت سے عطر حنا یا خس میں بسا ہو۔ چوڑی دار پاجامے میں خوبرو دوشیزہ کے ہاتھ کا بنا ہوا سفید ریشمی ازار بند۔ سفید نری کا سلیم شامی جوتا۔ پیروں پر ڈالنے کے لیے اٹالین کمبل جو فن میں جتے ہوئے سفید گھوڑے کی دم اور دور مار بول و براز سے پاجامے کو محفوظ رکھے۔ فن کے پچھلے پائیدان پر ”ہٹو بچو“ کرتا اور اس پر لٹکنے کی کوشش کرنے والے بچوں کو چابک مارتا ہوا سائیکس، جس کی کمر پر زروزی کے کام کی پٹی اور ٹخنے سے گھٹنے تک خاکی نمڈے کی نواری پٹیاں بندھی ہوں۔ بچہ اب سیانا ہو گیا تھا۔ بچپن رخصت ہو گیا، پر بچپنا نہیں گیا۔

بچہ اپنے کھیل میں جیسی سنجیدگی اور ہمہ تن محویت اور خود فراموسی دکھاتا ہے، بڑوں کے کسی مشن اور مہم میں اس کا عشرِ عشر بھی نظر نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی کسی کھیل میں منہمک بچے سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔ کھلونا ٹوٹنے پر بچے نے روتے روتے اچانک روشنی کی طرف دیکھا تھا تو آنسو میں دھنک جھل جھل کرنے لگی تھی۔ پھر وہ سبکیاں لیتے لیتے سو گیا تھا۔ وہی کھلونا بڑھاپے میں کسی جادو کے زور سے اس کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے تو وہ بھونچکا رہ جائے گا کہ اس کے ٹوٹنے پر بھی بھلا کوئی اس طرح جی جان سے روتا ہے۔ یہی حال ان کھلونوں کا ہوتا ہے جن سے آدمی زندگی بھر کھیلتا رہتا ہے۔ ہاں، عمر کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدلتے اور بڑے ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ کھلونے خود بخود ٹوٹ جاتے ہیں۔ کچھ کو دوسرے توڑ دیتے ہیں۔ کچھ کھلونے پروموٹ ہو کر دیوتا بن جاتے ہیں اور کچھ دیویاں دل سے اترنے کے بعد گودڑ بھری گڑیاں نکلتی ہیں۔ پھر ایک ابھاگن گھڑی ایسی آتی ہے جب وہ ان سب کو توڑ دیتا ہے۔ اس گھڑی وہ خود بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

تراشیدم پرستیدم شکستم

آج ان طفلانہ تمناؤں پر خود ان کو ہنسی آتی ہے۔ مگر یہ اس وقت کی حقیقت تھی۔ بچے کے لیے اس کے کھلونے سے زیادہ ٹھوس اور اصل حقیقت ساری کائنات میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ جب خواب، خواہ وہ خواب نیم شبی ہو یا خواب بیداری، دیکھا جا رہا ہوتا ہے تو وہی اور صرف وہی اس لمحے کی واحد حاضر و موجود حقیقت ہوتی ہے۔ یہ ٹوٹا کھلونا، یہ آنسوؤں میں بھیگی پتنگ اور ابھی ہوئی ڈور جس پر ابھی اتنی مار کٹائی ہوئی، یہ جلتا بجھتا جگنو، یہ تپتا ہوا غبارہ جو اگلے لمحے ربر کے گھلے ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائے گا، میری ہتھیلی پہ سرسراتی یہ مٹلی ہیر ہسوئی، آواز کی رفتار سے بھی تیز چلنے والی یہ ماچس کی ڈبیوں کی ریل گاڑی، یہ صابن کا بلبلا جس میں میرا سانس تھرا رہا ہے، دھنک پر یہ پریوں کا رتھ جسے تتلیاں کھینچ رہی ہیں۔ اس پل، اس آن بس یہی اور صرف حقیقت ہے۔

اور یہ عالم تمام وہم و ظلم و مجاز

○ کچھ قوس قزح سے رنگے لیا کچھ نور چرایا تاروں سے

یہ قصہ کھلونا ٹوٹنے سے پہلے کا ہے۔

وہ اس زمانے میں نئے نئے اسکول ماسٹر مقرر ہوئے تھے اور سیاہ فتن ان کی تمناؤں کی معراج تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس یونیفارم یعنی سفید اچکن، سفید جوتے، سفید کرتے پاجامے اور سفید ازار بند وغیرہ کی کھکھیڑ فقط خود کو سفید گھوڑے سے میچ کرنے کے لیے تھی۔ ورنہ اس بطنیا بھیس پر کوئی بطنی ہی فریفتہ ہو سکتی تھی۔ انہیں چوڑی دار سے بھی سخت چڑ تھی۔ صرف خوبرو دوشیزہ کے ہاتھ کے بنے ہوئے سفید ازار بند کو استعمال کرنے کی خاطر یہ ستار کا غلاف ٹانگوں پر چڑھانا پڑا۔ اس ہوائی قلعے کی ہر اینٹ فیوڈل گارے سے بنی تھی۔ جو بورڈوا خوابوں سے گندھا تھا۔ اتنا ہی نہیں کہ ہر اینٹ کا سائز اور رنگ مختلف تھا، ہر ایک پر ان کی ابھرواں شبیہ بھی بنی تھی۔ کچھ اینٹیں گول بھی تھیں،

باریک سے باریک جزئیات، یہاں تک کہ اس حد ادب کا بھی تعین کر دیا تھا کہ ان کے حضور سفید گھوڑ کی دم کتنی ڈگری کے زاویے تک اٹھ سکتی ہے۔ اور ان کی سواری باد بہاری کے ”روٹ“ پر کس کس جھروکے کی ہتھیلی پر ان کا نام (مع بی اے کی ڈگری) مندی سے لکھا ہے۔ اور کس کس کی سرگیں آنکھیں چلن سے لگی راہ تک رہی ہیں اور تیلیوں کو بار بار انگلیوں سے چوڑا کر کے دیکھ رہی ہیں کہ کب انقلابی شہزادہ یہ دعوت دیتا ہوا آتا ہے کہ

تم پرچم لہرانا ساتھی، میں بربط پر گاؤں گا
یہاں اتنا عرض کرتا چلوں کہ اس سے زیادہ محفوظ تقسیم
کار اور کیا ہو گی کہ گھسٹن کے دن پر پرچم تو محبوب
اٹھائے اٹھائے کتنا مرتا پھرے اور خود شاعر دور کسی مرمریں
مینا میں بیٹھا ایک متروک اور دقیانوسی ساز پر ویسا ہی کلام
یعنی خود اپنا کلام گا رہا ہو۔ نثر میں اسی سیچوایشن کو دوسرے
کی سولی پر چڑھ جانے کی تلقین اور رام بھلی کرنے والی
کماوت میں ذرا زیادہ پھوڑ ایمانداری سے بیان کیا گیا ہے۔
لیجئے، مطلع میں ہی خن گسترانہ بات آ پڑی۔ ورنہ کہنا
صرف اتنا تھا کہ مزے کی بات یہ تھی کہ اس سوتے جاگتے
خواب کے دوران بشارت نے خود کو اسکول ماسٹر ہی کے ”رول“
میں دیکھا۔ منصب بدلنے کی خواب میں بھی جرات نہ ہوئی۔
شاید اس لیے بھی کہ فن اور ریشی ازار بند سے صرف
اسکول ماسٹروں پر ہی رعب پڑ سکتا تھا۔ زمینداروں اور جاگیرداروں
کے لیے یہ چیزیں کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ انہیں اپنی پیٹھ
پر بیس برس بعد بھی اس آتشیں لکیر کی جلن محسوس ہوتی

تھی جو چابک لگنے سے اس وقت اپڑی تھی جب محلے کے لونڈے کے ساتھ شور مچاتے،
چابک کھاتے وہ ایک رئیس کی سفید گھوڑے والی فٹن کا پیچھا کر رہے تھے۔

○ چوراہے بلکہ شش و پنج راہے پر

شعر و شاعری چھوڑ کر اسکول ماسٹری اختیار کی۔ اسکول ماسٹری کو دھتا بنا کر دکانداری کی۔
اور آخر کار دکان بیچ کھوچ کر کراچی آ گئے، جہاں ہرچند رائے روڈ پر دیوانہ عمارتی
لکڑی کا کاروبار شروع کیا۔ نیا ملک، بدلا بدلا سا رہن سہن۔ ایک نئی اور مصروف دنیا میں
قدم رکھا۔ مگر اس سفید گھوڑے اور فٹن والی فینٹسی نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ خواب نیم
روز (Day Dreaming) اور فینٹسی سے دو ہی صورتوں میں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ اول،
جب وہ فینٹسی نہ رہے، حقیقت بن جائے۔ دوم، انسان کسی چوراہے بلکہ شش و پنج
راہے پر اپنے سوتے جاگتے ہمزاد سے سارے خواب بخشوا کر رخصت چاہے۔

Heart Breaker, Dream Maker, thank you for the dream!

اور اس مٹھونٹ نکل جائے جہاں سے کوئی
نہیں لوٹا، یعنی گھر گریستی کی طرف۔ لیکن
بشارت کو اس سے بھی افادہ نہیں ہوا۔ وہ
بھرا پرا گھر اونے پونے بیچ کر اپنے حسابوں
لئے پئے آئے تھے۔ پاکستان میں ایک دو
سال میں ہی اللہ نے ایسا فضل کیا کہ کانپور
بیچ معلوم ہونے لگا۔ سارے ارمان پورے
ہو گئے۔ مطلب یہ کہ گھر اشیائے غیر ضروری
سے اثاثے بھر گیا۔ بس ایک کمی تھی؟

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے گھوڑے کے سوا
اب وہ چاہتے تو نئی نہ سہی، سیکنڈ ہینڈ کار با آسانی خرید سکتے

تھے۔ جتنی رقم میں آج کل چار ٹائر آتے ہیں، اس سے کم میں اس زمانے میں کار مل جاتی تھی۔ لیکن کار میں انہیں وہ ریمسائڈ ٹھاٹ اور زمیندارانہ ٹھسا نظر نہیں آتا تھا جو فٹن اور بگھی میں ہوتا ہے۔ گھوڑے کی بات ہی کچھ اور ہے۔

○ گھوڑے کے ساتھ شجاعت بھی گنی

مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ آدمی جب بالکل جذباتی ہو جائے تو اس سے کوئی عقل کی بات کہنا ایسا ہی ہے جیسے بگولے میں بیج بونا۔ چنانچہ بشارت کو اس شوق فضول سے باز رکھنے کے بجائے انہوں نے الٹا خوب چڑھایا۔ ایک دن آگ کو پٹرول سے بجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب سے گھوڑا رخصت ہوا، دنیا سے شجاعت و سرفروشی، جاں بازی اور دلاوری کی ریت بھی اٹھ گئی۔ جانوروں میں کتا اور گھوڑا انسان کے سب سے پہلے اور پکے رفیق ہیں جنہوں نے اس کی خاطر ہمیشہ کے لیے جنگل چھوڑا۔ کتا تو خیر اپنے کتے پن کی وجہ سے چمٹا رہا، لیکن انسان نے گھوڑے کے ساتھ بیوفائی کی۔ گھوڑے کے جانے سے انسانی تہذیب کا ایک ساونتی باب ختم ہوتا ہے۔ وہ باب، جب سورما اپنے دشمن کو لکار کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے لڑتے تھے۔ موت ایک نیزے کی دوری پر ہوتی تھی اور یہ نیزہ دونوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ موت کا ذائقہ اجنبی سہی، لیکن مرنے والا اور مارنے والا دونوں ایک دوسرے کا چہرہ پہچان سکتے تھے۔ غافل سوتے ہوئے، بے چہرہ شہروں پر مشروم بادل کی اوٹ سے آگ اور ایٹمی موت نہیں برستی تھی۔ گھوڑا صرف اس وقت بزدل ہو جاتا ہے جب اس کا سوار بزدل ہو۔ بہادر گھوڑے کی ٹاپ کے ساتھ دل دھک دھک کرتے اور دھرتی تھر تھراتی تھی۔ پیچھے دوڑتے ہوئے بگولے، سموں سے اڑتی چنگایاں نیزوں کی انی پر کرن کرن بکھرتے سورج اور سانسوں کی بانپتی آندھیاں کوسوں دور سے شدہ سواروں کی یلغار کا اعلان کر دیتی تھیں۔ گھوڑوں کے ایک

ساتھ دوڑنے کی آواز سے آج بھی لبو میں ہزاروں سال پرانی وحشتوں کے الاؤ بھڑک اٹھتے ہیں۔

لیکن مرزا ذرا ٹھہرو! اپنے تو سن خطابت کو لگام دو۔ یہ کس گھوڑے کا ذکر کر رہے ہو؟ تانگے کے گھوڑے کا؟

○ گل جی کے گھوڑے

لیکن یہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ گھوڑے کے بغیر طالع آزمائی، ملک گیری، شجاعت اور ”شوری“ کے عہد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ”گھوڑے کی کاٹھی ہی ہمارا راج سگھاس ہے۔“ گائیکوڑوں کو اپنے قدیم شاہی ”مانو“ پر بڑا ناز تھا۔ یورپ کو تاخت و تاراج کرنے والے ہن شاہ سواروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی گھوڑے سے نہیں اترتے تھے۔ اس کی پیٹھ پر ہی سوتے، سساتے، کھاتے، شراب نوشی اور خرید و فروخت کرتے، یہاں تک حوائج ضروری سے فارغ ہوتے۔ انگلینڈ میں اسٹب نامی ایک آرٹس گزرا ہے جو صرف اعلیٰ نسل کے گھوڑے پیٹ کرتا تھا۔ یورپ میں گھوڑوں، کتوں اور رائلی کی حد تک ولدیت اور شجرۂ نسب اب بھی تھوڑے بہت معنی رکھتے ہیں۔ گھوڑے کو برہنہ ماڈلوں پر ترجیح دینے کی وجہ ہمیں تو بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ عورت کے دم نہیں ہوتی۔ اس میں یہ غایت بھی تھی کہ گھوڑا کبھی مطالبہ نہیں کرتا کہ تصویر اصل کے مطابق نہ ہو، بہتر ہو۔ ہم پاکستان کے ممتاز اور نامور آرٹس گل جی کے گیارہ سال دیوار بچ پڑوسی رہ چکے ہیں۔ انہیں بہت قریب سے پیٹ کرتے دیکھا ہے۔ وہ صرف رات کو، اور وہ بھی بارہ بجے کے بعد پیٹ کرتے ہیں۔ کافی عرصے تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید انہیں رات میں بہتر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب سے خود ہم نے السر کی تکلیف کے سبب رات کو لکھنا پڑھنا شروع کیا، ہمسائے کے بارے میں بد گمانی سے کام لینا چھوڑ دیا۔

کیا تجھ کو خبر کون کہاں جھوم رہا ہے
 انیس بھی گھوڑوں سے بے انتہا شغف ہے۔ ان کی تصویریں
 بنا کے لاکھوں کماتے ہیں۔ سنا ہے ایک دفعہ کسی نے (ہم
 نے نہیں) مذاق میں کہہ دیا کہ جتنے کی آپ ایک گھوڑے
 کی تصویر بیچتے ہیں، اس میں تو تین زندہ گھوڑے با آسانی
 آسکتے ہیں۔ اتنا تو ہم نے بھی دیکھا کہ اس کے بعد وہ
 کیونس پر کم از کم تین گھوڑے بنانے لگے۔ یہ بھی دیکھا
 کہ جتنے پیار، تفصیل وار موشمائی اور انسپریشن سے وہ گھوڑے
 کی دم بناتے ہیں، اس کا سواں حصہ بھی گھوڑے اور سوار
 پر صرف نہیں کرتے۔ صرف گھوڑے ہی کی نہیں، سواری
 کی بھی ساری پرسنلٹی کھینچ کر دم میں آ جاتی تھی۔ چنانچہ
 ہر دم منفرد، البیلی اور انمول ہوتی ہے۔ دل کی بات پوچھئے
 تو وہ فقط دم ہی بنانا چاہتے ہیں۔ باقیماندہ گھوڑا نہیں فقط
 دم کو اٹکانے کے لیے طوعاً و کرہاً بنانا پڑتا ہے۔ کبھی کسی
 وی آئی پی خاتون کی پورٹریٹ خاص توجہ سے بہت ہی خوبصورت
 بنانی مقصود ہوتی تو اس کے بالوں کی پونی ٹیل بطور خاص
 ایسی بناتے تھے کہ کوئی گھوڑا دیکھ لے تو بے قرار ہو
 ہو جائے۔

○ بلبَل فقط آواز ہے طاؤس فقط دم

یوں بنانے کو تو انہوں نے البیلے اونٹ بھی بکثرت بنائے ہیں اور اٹلے بانس بریلی بھیجے
 ہیں۔ یعنی درجنوں کے حساب سے عرب ممالک کو روغنی اونٹ ایکسپورٹ کئے ہیں۔ ان

کے بعض اونٹ تو اتنے مہنگے ہیں کہ صرف بینک، شیوخ، غیر ملکی سفارت کار اور مقامی اسمگلر ہی خرید سکتے ہیں۔ یونائیٹڈ بینک نے ان سے جو نایاب اونٹ خریدے وہ اتنے بڑے نکلے کہ ان کے ٹانگے کے لیے ہال کے بیچوں بیچ ایک دیوار علیحدہ سے بنوانی پڑی لیکن انہیں دیکھ کر شیوخ اتنے خوش ہوئے کہ بعض نے اصل یعنی بالکل انہی جیسے اونٹوں کی فرمائش کر دی۔ اب بینک اس محفے میں پڑ گیا کہ

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

پٹرو ڈالر ڈپازٹ کے لالچ میں بینک کو ان سے تھوڑی بہت مشابہت رکھنے والے اونٹ تلاش کر کے چارے سمیت ایکسپورٹ کرنے پڑے۔ جب ہم یونائیٹڈ بینک سے متعلق و منسلک ہوئے تو ایک دن ہمت کر کے گل جی سے کہا کہ حضور اگر آپ آئندہ ایسے اونٹ بنائیں جو اس عالم آب و گل میں با آسانی دستیاب ہو جایا کریں تو بینک کو شیوخ کی فرمائش پوری کرنے میں آسانی رہے گی۔ نوکری کا سوال ہے۔ اور ہاں ان پر کبھی کسی بے پردہ خوبصورت عورت کو سوار نہ دکھائیں۔ گل جی بلا کے ذہین، زود رنج اور حاضر جواب آرٹسٹ ٹھہرے۔ بہت منعخص ہوئے۔ پھر کچھ خیال آیا تو سنبھل کر انگریزی میں بولے۔ ”بابا ہم سیدھے سادے اسمبلی آغا خانی مزدور، تابعدار، مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب میں آئل پینٹ کو بد چلن اونٹنی کے دودھ میں کس کر کے کنواری گھوڑی کی دم کے بالوں کے برش سے اونٹ بناؤں۔ لاگت اور قیمت دگنی ہو جائے گی۔ سوچ لیجئے۔ (اردو میں) صاحب آپ فقیروں سے مسخری کرتے ہیں۔ پکاسو کہتا

ہے کہ پینٹنگ اندھوں کا پیشہ ہے۔ آرٹ وہ پینٹ نہیں کرتا جو وہ دیکھتا ہے، بلکہ جو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ ”ہم نے ان کے طنز کا برا نہیں مانا۔ اول تو ”مرد دانا پر کلام گرم و گجنگ بے اثر“ دوسرے، ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ تین چار سو سال پرانی راجپوت پینٹنگ میں جو شوخ اور نایاب ہلدی سے بھی پیلا رنگ نظر آتا ہے، وہ اس طرح بنایا جاتا تھا کہ پہلے گائے کو مسلسل کئی دن آم کے پتے کھلاتے۔ پھر اس کے پیشاب سے یہ پیلا رنگ بناتے تھے۔ یہی رنگ کپے ہوئے رس بھرے آموں، بھنتی چولیں اور راجاؤں کی پر غرور پگڑیوں میں بھرتے تھے۔

بہر کیف گل جی کے اونٹ میں وہ گھوڑے والی بات پیدا نہ ہو سکی۔ اور ہوتی بھی کیسے! کہاں گھوڑے کی تا بہ زانو گھنیری چنور شاہی دم، کہاں اونٹ کی پونچھڑی! دم نہیں دم کا ٹوٹا کھنٹے۔ مرزا کہتے ہیں کہ اس سے تو ڈھنگ سے شتر پوشی بھی نہیں ہو سکتی۔ ہر جانور کی دم کا کچھ نہ کچھ مصرف ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً لنگور کی دم درختوں سے لٹکنے اور گدرائے ہوئے پھل اور مادہ پر کند ڈالنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ آقا کے سامنے بے اختیار ہٹنے والی کتے کی دم پچھلے جنم میں کسی مصاحب کی زبان تھی۔ کتا اس کام کے لیے اپنی زبان استعمال نہیں کرتا۔ شتر مرغ کی دم مغربی خواتین کی سر کی زینت کے لیے بنی ہے۔ بعض جانور کو دم محض اس لیے دی گئی ہے کہ دکھیا کے پاس دبا کر بھاگنے کے لیے کچھ تو ہو۔ دانا اس رمز کو جانتے ہیں کہ بعض اوقات غریب کو مونچھ صرف اس لیے رکھنی پڑتی ہے کہ بوقت ضرورت نیچی کر کے جان کی امان پائے۔

مور کی دم شہریوں کو ناچ دکھانے کے لیے نہیں، بلکہ جنگل میں مورنی کو رجھانے اور پیروں کے مزاروں پر جاروب کشی کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ لالچ نہ ہوتا تو ذرا سے جھٹے پر اتنا جھاڑ جھنکار کا ہے کو اٹھائے اٹھائے پھرتا۔ ذرا ایک لحظہ کے لیے آنکھ بند کر کے غور فرمائیے، مور کو اگر شیو کر دیا جائے تو بالکل الو معلوم ہو گا۔

لیکن اونٹ کی دم سے مادہ کو ربحانا تو درکنار کسی بھی معقول یا نامعقول جذبے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو تو ٹھیک سے ٹکنا بھی نہیں آتا۔ سچ پوچھے تو بس مور برڈ آف پیراڈائز اور کیسینو کی Bunnies کی ہوتی ہے۔ آخر الذکر ہمیں اس لیے بھی اچھی لگتی ہے کہ وہ ان کی اپنی نہیں ہوتی اور اس کا مقصد آدمی کے اندر سوئے ہوئے اور ہارنے والے خرگوش کو گدگدا کر جگانا ہے۔ برڈ آف پیراڈائز چکور کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن نہ کی دم 'خدا جھوٹ نہ بلوائے' پندرہ پندرہ فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اگر بہت سے نر اونچے اونچے درختوں پر اپنی متعلقہ دس لٹکائے امیدوار کرم بیٹھے ہوں تو مادہ ان کی شوہرانہ اہلیت جانچنے کے لیے وہی پیمانہ استعمال کرتی ہے جس سے اگلے زمانے میں علماء و فضلاء کا علم ناپا جاتا تھا۔ مطلب یہ کہ فقط معلومات یعنی واڑھی، شملہ اور دم کی لمبائی پر فیصلے کا انحصار۔ جس کی دم سب سے لمبی ہو، مادہ اسی کے پرلے سرے پر لگی ہوئی منی سی چونچ میں اپنی چونچ ڈال دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے بامقصد دم بچھو کی ہوتی ہے۔ سانپ کا زہر کچلی میں اور بچھو کا دم میں ہوتا ہے۔ بھڑ کا زہر ڈنک میں رہتا ہے اور پاگل کتے کا زبان میں۔ انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔ لکھتے لکھتے یوں ہی خیال آیا کہ ہم بچھو ہوتے تو کس کس کو کاٹتے۔ اپنے ناپسندیدہ اشخاص کی فہرست کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ایک زندگی تو اس مشن کے لیے بالکل ناکافی ہوتی۔ لیکن یہاں تک فہرست ہی نہ آتی اس لیے کہ ہمارے معتبیین کی فہرست میں سب سے پہلا نام تو ہمارا اپنا ہی ہے۔ رسی سانپ کی دم، تو وہ ہمیں پسند تو نہیں 'Fascinate' ضرور کرتی ہے۔ اس میں وہی خوبی پائی جاتی ہے جو ہماری پیشانی میں ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ پھن کو چھوڑ کر ہمیں تو سارا سانپ دم ہی دم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سب سے اعلیٰ و افضل وہ دم قرار پائے گی جو جھڑ چکی ہے۔ اس لیے کہ اس حادثے کے بعد ہی اشرف المخلوقات اور خلیفہ

الارض کا درجہ ملا ہے۔

○ ہماری سواری ○ کیلے کا چھلکا

فن اور گھوڑے سے بشارت کی شیفتگی کا ذکر کرتے کرتے ہم کہاں آٹکے۔ مرشدی و آقائی مرزا عبدالودود بیک نے ایک دفعہ بڑے تجربے کی بات کہی۔ فرمایا۔ ”جب آدمی کیلے کے چھلکے پر پھسل جائے تو پھر رکنے، بریک لگانے کی کوشش ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس سے اور زیادہ چوٹ آئے گی۔ بس آرام سے پھسلتے رہنا چاہیے اور پھسلنے کو انجوائے کرنا چاہیے۔ بقول تمہارے استاد ذوق کے، تم بھی چلے چلو یہ جہاں تک چلی چلے۔ کیلے کا چھلکا جب تھک جائے گا تو خود بخود رک جائے گا۔ Just Relax ----- لہذا قدم ہی نہیں، قلم یا نگاہ تصور بھی پھسل جائے تو ہم اسی اصول پر عمل کرتے ہیں۔ بلکہ صاف صاف کیوں نہ اقرار کر لیں کہ زندگی کے طویل سفر میں کیلے کا چھلکا ہی ہماری واحد سواری رہا ہے۔ یہ جو کبھی کبھی ہماری چال میں جوانوں کی سی تیزی اور صحت مند چلت پھرت آ جاتی ہے تو یہ اسی کے طفیل ہے۔ ایک دفعہ رہٹ جائیں تو پھر یہ قلم چال جو بھی کنویں جھٹکوائے اور جن گلیوں گلیاروں میں لے جائے وہاں بے ارادہ لیکن برغبت جاتے ہیں۔ قلم کو روکنے تھامنے کی ذرا کوشش نہیں کرتے۔ اور جب بیروں کی پوٹ پھٹ کر کانغذ پر بکھر جاتی ہے تو ہماری مثال اس بچے کی سی ہوتی ہے جس کی ٹھسا ٹھس بھری ہوئی جیب کے تمام رازوں کو کوئی اچانک نکال کر سب کے سامنے میز پر نمائش لگا دے۔ زیادہ خفت بڑوں کو ہوتی ہے کہ انہیں اپنا بھولا بسرا بچپن اور اپنی موجودہ میز کی درازیں یاد آ جاتی ہیں۔ جس دن بچے کی جیب سے فضول چیزوں کے بجائے پیسے برآمد ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے بے فکری کی نیند کبھی نصیب نہیں ہو گی۔

○ رہیں کورس سے تانگے تکے

جیسے جیسے بزنس میں منافع بڑھتا گیا فن کی خواہش بھی شدید تر ہوتی گئی۔ بشارت مہینوں گھوڑے کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے گھوڑے کے بغیر ان کے سارے کام بند ہیں۔ اور بادشاہ رچرڈ سوم کی طرح وہ ہر چیز گھوڑے کی خاطر تہ تیہ دینے کے لیے تیار ہیں۔

A Horse! a horse! my kingdom for a horse!
ان کے پڑوسی چوہدری گرم الٹی نے مشورہ دیا کہ ضلع سرگودھا کے پولیس اسٹڈ فارم سے رجوع کیجئے۔ وہاں پولیس کی نگرانی میں 'تھارو بریڈ اور اعلیٰ ذات کے گھوڑوں سے افزائش نسل کروائی جاتی ہے۔ گھوڑے کا باپ خالص اور اصیل ہو تو بیٹا لا محالہ اسی پر پڑے گا۔ مثل ہے کہ باپ پر پوتہ پتا پر گھوڑا' بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ مگر بشارت کہنے لگے کہ "میرا دل نہیں ٹھکتا۔ بات یہ ہے کہ جس گھوڑے کی پیدائش میں پولیس کا حمل دخل ہو" وہ خالص ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ گھوڑا پولیس پر پڑے گا۔"
گھوڑے کے بارے میں یہ گفتگو سن کر پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے' بی ٹی نے وہ مشہور شعر پڑھا اور حسب معمول بے محل پڑھا' جس میں دیدہ ور کی ولادت سے رونما ہونے والی پیچیدگیوں کے ڈر سے نرگس ہزاں روتی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس اپنی دانست میں کوئی بہت ہی دانائی کی بات کہنے کے لیے اگر بیچ میں بولیں تو بیوقوف معلوم ہوتے ہیں۔ اگر نہ بولیں تو اپنے چہرے کے نارمل ایکسپریشن کے سبب اور زیادہ بیوقوف لگتے ہیں۔ گویا "گویم مہمل وگر نہ گویم مہمل"
پروفیسر مذکور کے نارمل ایکسپریشن سے مراد چہرے پر وہ رنگ ہیں جو اس وقت آتے اور جاتے ہیں جب کسی کی زپ ادھ بیچ میں اٹک جاتی ہے۔

خدا خدا کر کے ایک گھوڑا پسند آیا جو ایک اسمیل ری رولنگ مل کے سینٹھ کا تھا۔ تین چار دفعہ اسے دیکھنے گئے اور ہر دفعہ پہلے سے زیادہ مطمئن ہوئے۔ اس کا سفید رنگ

ایسا بھایا کہ اٹھتے بیٹھتے اسی کے چرچے، اسی کے قصیدے۔ ہم نے ایک دفعہ پوچھا۔ ”ہیج کلیان ہے؟“ حقارت آمیز انداز سے ہنسے۔ فرمایا ”ہیج کلیان تو بھینس بھی ہو سکتی ہے“ فقط چہرہ اور ہاتھ پیر سفید ہونے سے گھوڑے کی دم میں سرخاب کا پر نہیں لگ جاتا۔ گھوڑا وہ جو آٹھوں گانٹھ کیت ہو۔ چاروں ٹخنوں اور چاروں گھٹنوں کے جوڑ مضبوط ہونے چاہئیں۔ یہ بھاڑے کا ٹٹو نہیں، ریس کا خاندانی گھوڑا ہے۔“ یہ گھوڑا ان کے اعصاب پر اس بری طرح سوار تھا کہ اب اسے ان پر سے کوئی گھوڑی ہی اتار سکتی تھی۔ سیٹھ نے انہیں ایسوی اینڈ پرنٹرز میں طبع شدہ کراچی کلب کا وہ کتابچہ بھی دکھایا جو اس ریس سے متعلق تھا جس میں اس گھوڑے نے حصہ لیا اور اول آیا تھا۔ اس میں اس کی تصویر اور تمام کوائف مع شجرۂ نسب درج تھے۔

نام White Rose ولد Wild Oats ولد Old Devil۔ جب سے یہ اعلیٰ نسل کا گھوڑا دیکھا، انہوں نے اپنے ذاتی بزرگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیا۔ ان کے بیان کے مطابق اس کے دادا نے بمبئی میں تین ریسیں جیتیں۔ چوتھی میں دوڑتے ہوئے ہارٹ فیل ہو گیا۔ اس کی دادی بڑی نرچک تھا۔ اپنے زمانے کے نامی گرامی ولایتی گھوڑوں سے اس کا تعلق نہ چکا تھا۔ اس کے دامن عصمت سے تمسک و تمتع کی بدولت چھ نرینہ اولادیں ہوئیں۔ ہر ایک اپنے متعلق باپ پر پڑی۔ سیٹھ سے پہلے وہاٹ روز ایک بگڑے رئیس کی ملکیت تھا جو ہاتھ آئی لینڈ میں ایک کوٹھی ”ونڈر لینڈ“ نام کی اپنی اینگلو انڈین بیوی ایس کے لیے بنا رہا تھا۔ ری رولنگ مل سے جو سریا وہ خرید کر لے گیا تھا اس کی رقم کئی مہینے سے اس کے نام کھڑی تھی۔ ریس اور شے میں دوالا نکلنے کے سبب ونڈر لینڈ کی تعمیر رک گئی اور ایس اسے حیرت زدہ چھوڑ کر ملان کے ایک زمیندار کے ساتھ یورپ کی سیر کو چلی گئی۔ سیٹھ کو ایک دن جیسے ہی خبر ملی کہ ایک قرض خواہ اپنے واجبات کے عوض پلاٹ پر پڑی ہوئی سینٹ کی بویاں اور سریا اٹھوا کے لے گیا۔ اس نے اپنے مینجر کو پانچ لٹھ بند چوکیداروں کی نفری ساتھ لے کر ہاتھ آئی لینڈ بھیجا کہ بھاگتے بھوت کی جو چیز بھی ہاتھ لگے کھوٹ لائیں۔ لہذا وہ یہ گھوڑا اصطبل سے کھول

لائے۔ وہیں ایک سیامی بلی نظر آ گئی۔ سوائے بھی بوری میں بھر کے لے آئے۔ گھوڑے کی ٹریچڈی کو پوری طرح ذہن نشین کرانے کے لیے بشارت نے ضمناً ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ فرمایا۔ ”یہ گھوڑا تانگے میں جتنے کے لیے تھوڑا ہی پیدا ہوتا تھا۔ سیٹھ نے بڑی زیادتی کی۔ مگر قسمت کی بات ہے۔ صاحب تین سال پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ آپ یوں بینک میں جوت دیئے جائیں گے۔ کہاں ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی کرسی اور کہاں بینک کا چار فٹ اونچا اسٹول“

○ شای ساری

انہیں اس گھوڑے سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی۔ اور محبت اندھی ہوتی ہے، خواہ گھوڑے سے ہی کیوں نہ ہو۔ انہیں یہ تک بھائی نہ دیا کہ گھوڑے کی مدح میں اساتذہ کے جو اشعار وہ اوٹ پٹانگ پڑھتے پھرتے تھے، ان کا تعلق تانگے کے گھوڑے سے نہیں تھا۔ یہ مان لینے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ گھوڑا شای ساری ہے۔ رعب شای اور شوکت شانہ کا تصور گھوڑے کے بغیر ادھورا بلکہ بالکل آدھا رہ جاتا ہے۔ بادشاہ کے قد میں گھوڑے کے قد کا اضافہ کیا جائے تب کہیں وہ قد آدم نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ بادشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کی مستقل اور دل پسند سواری در حقیقت رعایا ہوتی ہے۔ یہ ایک دفعہ اس پر سواری گانٹھ لیں تو پھر انہیں سامنے کوئی کنواں، کھائی، باڑھ اور رکاوٹ دکھائی نہیں دیتی۔ جوش شہ زوری و شہ سواری میں نوشتہ دیوار والی دیوار بھی پھلانگ جاتے ہیں۔ یہ نوشتہ دیوار اس وقت تک نہیں پڑھ سکتے جب تک وہ Braille میں نہ لکھا ہو۔ جسے وہ اپنا دیوار سمجھتے ہیں، وہ دراصل ان کا محاصرہ ہوتا ہے۔ جو انہیں یہ سمجھنے سے قاصر رکھتا ہے کہ جس منہ زور سر شور گھوڑے کو صرف ہنہانے کی اجازت دے کر با آسانی آگے سے کنٹرول کیا جاسکتا ہے، اسے وہ پیچھے سے قابو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ لگام کے بجائے دم مروڑتا ہے۔ مگر اس بظاہر

مسکین سواری کا اعتبار نہیں کہ یہ اہلق لقا سدا ایک چال نہیں چلتی۔
اکثر یہ بد رکاب بنی اور بگڑ گئی

○ غربا کشتن روز اول

لیکن جو حکمران ہوشیار، مردم شناس اور رموز و مصلحت مملکت سے آشنا ہوتے ہیں، وہ پہلے ہی دن غریبوں کی سرکوبی کر کے خواص کو عبرت دلاتے ہیں۔

غربا کشتن روز اول

ویسے خواص اور عمائد کو کسی تنبیہ اور آنکس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو بھی ان پر سونے کی عماری، چاندی کی گھنٹیاں، زر بفت کی جھول اور تمغوں کی مالا ڈال دے، اسی کا نشان کا ہاتھی بننے کے لیے کمر بستہ رہتے ہیں۔ پہلے کمر بستہ و دست و پا بستہ، پھر لب بستہ اور آخر میں فقط بستہ بردار۔ چار دن کی زندگی ملی تھی۔ سو دو آرزوئے حضوری میں کٹ گئے۔ دوجی حضوری میں۔

○ ہمارا کلام

ہم نے ایک دن گھوڑوں کی جناب میں کچھ گستاخی کر دی تو بشارت بھنا گئے۔ ہم نے بر سبیل تضحیک ایک تاریخی حوالہ دیا تھا کہ جب منگول ہزاروں کے غول بنا کر گھوڑوں پر نکلے تو بدبو کے ایسے بھکے اٹھتے تھے کہ بیس میل دور سے پتہ چل جاتا تھا۔ ارشاد فرمایا، معاف کیجئے، آپ نے راجستھان میں، جہاں آپ نے جوانی گنوائی، اونٹ ہی اونٹ دیکھے، جن کی پیٹھ پر کلف دار راجپوتی صاف، چڑھواں داڑھیاں اور دس فٹ لمبی نال

والی توڑے دار بندوقیں بجی ہوتی تھیں اور نیچے 'کندھے پہ رکھی لائچی کے سرے پر تیل پلائے ہوئے کچے چمڑے کے جوتے لٹکائے' اردلی میں ننگے پیر جاٹ۔ گھوڑا تو آپ نے پاکستان میں آن کر دیکھا ہے۔ میاں احسان الہی گواہ ہیں 'انہی کے سامنے آپ نے ان ٹھاکر صاحب کا قصہ سنایا تھا جو مہاراجہ کی شتر نال پلٹن میں رسالدار تھے۔ جب ریشٹرا ہو کر اپنے آبائی قصبے 'کیا نام تھا اس کا اودے پور تو را واٹی پنچے تو اپنی گڑھی میں ملاقاتیوں کے لیے دس بارہ مونڈھے ڈلوا دیئے اور اپنے لیے اپنے سرکاری اونٹ جنگ بہادر کا پرانا کجاوہ۔ اسی پر اپنی پلٹن کا شترگنی رنگ کا صافہ باندھے 'سینے پر تمنغے سجائے صبح سے شام تک بیٹھے ہلتے رہتے۔ ایک دن مل مل کر جنگ بہادر کے کارنامے بیان کر رہے تھے اور میڈل جھن جھن کر رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا۔ کجاوے پر ہی طائر روح قفسِ غصری سے پرواز کر کے اپنے عمودی سفر پر روانہ ہو گیا۔ دم واپس لبوں پر مسکراہٹ اور جنگ بہادر کا نام۔ معاف کیجئے 'یہ سب آپ ہی کے لیے ہوئے اسنیپ شائس ہیں۔ بندہ پرورا آپ بھی تو اپنے کجاوے سے نیچے نہیں اترے' نہ اتریں۔ مگر یہ کجاوہ خاکسار کی پیٹھ پر رکھا ہوا ہے۔ صاحب 'آپ گھوڑے کی قدر کیا جانیں۔ آپ تو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ سمند سیاہ زانو کس چٹیا کا نام ہے 'خجر کا کراس کیسے ہوتا ہے' کھیرا کس شکل کا ہوتا ہے' کنوتیاں کہاں ہوتی ہیں' تیل کے آر کہاں چھوٹی جاتی ہے' چلغونہ کس زبان کا لفظ ہے؟

آخری دو سوال کلیدی اور فیصلہ کن تھے۔ اس لیے کہ ان سے پتہ چلتا تھا کہ بحث کس نازک مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ کج بحثی ہمیں اس لیے اور بھی ناگوار گزری کہ ہمیں ایک بھی سوال کا جواب نہیں آتا تھا۔ وہ "اوکھے" نہیں 'طبع بہت دھیمے اور میٹھے آدمی ہیں۔ لیکن جب وہ اس طرح پنہزی سے اتر جائیں تو ہمیں دور تک کچے میں کھدیڑتے 'گھسیٹتے لے جاتے ہیں۔ کہنے لگے۔ "جو شخص گھوڑے پر نہیں بیٹھتا" وہ کبھی سیر چشم، غیور اور شیر دلیر نہیں ہو سکتا۔" ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ اس لیے کہ

وہ خود بھی کبھی گھوڑے پر نہیں بیٹھے تھے۔

○ جنازے سے دور رکھنا

انہیں ایک عرصے سے زندگی میں جو روحانی خلا محسوس ہو رہا تھا، وہ اس گھوڑے نے پر کر دیا۔ انہیں بڑی حیرت ہوتی تھی کہ اس کے بغیر اب تک کیسے بلکہ کاہے کو جی رہے تھے۔

I wonder by my troth what thou and I did till we loved Donne
اس گھوڑے سے ان کی شیفٹنگلی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ فٹن کا خیال چھوڑ کر سیٹھ کا تانگہ بھی ساڑھے چار سو روپے میں خرید لیا، حالانکہ انہیں بالکل پسند نہیں تھا۔ بہت بڑا اور گنوارو تھا۔ لیکن کیا کیا جائے، سارے کراچی میں بھی ایک بھی فٹن نہیں تھی۔ سیٹھ گھوڑا اور تانگہ ساتھ بیچنا چاہتا تھا۔ یہی نہیں، اس نے دانے کی دو بوریوں، گھاس کے پانچ پولوں، گھوڑے کے فریم کئے ہوئے فوٹو، ہانصے کے نمک، دوا اور تیل پلانے کی نال، کھریے اور تو بڑے کی قیمت ساڑھے انتیس روپے علیحدہ دھروالی۔ وہ اس دھاندلی کو ”پسکج ڈیل“ کہتا تھا۔ گھوڑے کے بھی منہ مانگے دام دینے پڑے۔ گھوڑا گر اپنے منہ سے دام مانگ سکتا تو یقیناً سیٹھ کے مانگے ہوئے داموں یعنی نو سو روپے سے کم ہی ہوتے۔ گھوڑے کی خاطر بشارت کو سیٹھ کا تکیہ کلام ”کیا؟“ اور ”سلا“ بھی برداشت کرنا پڑا۔ چکنا حساب کر کے جب انہوں نے لگام اپنے ہاتھ میں تھام لی اور یہ یقین ہو گیا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت ان سے ان کے خواب کی تعبیر نہیں چھین سکتی تو انہوں نے سیٹھ سے پوچھا کہ آپ نے اتنا اچھا گھوڑا کیوں بیچ دیا؟ کوئی عیب ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ”دو مہینے پہلے کی بات ہے، میں تانگے میں لارنس روڈ سے لی مارکیٹ جا رہا تھا۔ میونسپل ورکشاپ کے پاس پہنچا ہوں گا کہ سامنے سے ایک سلا جتانہ آتا دکھائی پڑا، کیا؟ کسی پولیس افسر کا تھا۔ گھوڑا آل آف اے سڈن بدک گیا۔ پر کندھا دینے

والے اس سے بھی زیادہ بدکے۔ بے فضول ڈر کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کیا؟ سچ سڑک پہ جنازے کی مٹی خراب ہوئی۔ ہم سلاالو کے موافق بیٹھا دیکھتا پڑا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، بیکار بندھا کھا رہا ہے۔ دل سے اتر گیا۔ کیا؟ ویسے عیب کوئی نہیں۔ بس جنازے سے دور رکھنا اچھا، سلاما لیکم!“

”آپ نے یہ پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”تم نے پہلے کیوں نہیں پوچھا؟ سلاما لیکم“

○ جگہ میں چلے پونہ کی چال

انہوں نے ایک کوچوان رحیم بخش نامی ملازم رکھ لیا۔ تنخواہ منہ مانگی، یعنی پنتالیس روپے اور کھانا کپڑا۔ گھوڑا انہوں نے صرف رنگ، دانت اور گھنیری دم دیکھ کر خریدا تھا۔ اور وہ ان حصوں سے اتنے مطمئن تھے کہ باقیماندہ گھوڑے کی جانچ پڑتال ضروری نہ سمجھی۔ کوچوان بھی کچھ اسی طرح رکھا۔ یعنی صرف زبان پر ریجہ کر۔ باتیں بنانے میں طاق تھا۔ گھوڑے جیسا چہرہ۔ ہنستا تو معلوم ہوتا گھوڑا ہنستا رہا ہے۔ تیس سال گھوڑوں کی صحبت میں رہتے رہتے ان کی تمام عادتیں، عیب اور بدبوئیں اپنا لی تھیں۔ گھوڑے کے اگر دو ٹانگیں ہوتیں تو یقیناً اسی طرح چلتا۔ بچوں کو اکثر اپنا بایاں کان بلا کر دکھاتا۔ فٹ بال کو ایڑی سے دولتی مار کر پیچھے کی طرف گول کرتا تو بچے خوشی سے تالیاں بجاتے۔ گھوڑے کے پنے کی چوری کرتا تھا۔ بشارت کہتے تھے۔ ”یہ منحوس چوری چھپے گھاس بھی کھاتا ہے، ورنہ ایک گھوڑا اتنی گھاس کھا ہی نہیں سکتا۔ جیسی تو اس کے بال ابھی تک کالے ہیں۔ دیکھتے نہیں، حرام خور تین عورتیں کر چکا ہے۔“ موضوع کچھ بھی ہو تمام تر گفتگو سائیس اصطلاحوں میں کرتا اور رات کو چابک لے کر سوتا۔ دو میل کے دائرے میں کہیں بھی گھوڑا یا گھوڑی ہو، وہ فوراً بو پا لیتا اور اس کے نتھنے پھڑکنے لگتے۔ راستے میں کوئی خوبصورت گھوڑی نظر آ جائے تو وہیں رک جاتا اور آنکھ

مار کے تانگے سے اس کی عمر پوچھتا۔ پھر اپنے گھوڑے کا چرمی چشم بند اٹھاتے ہوئے کہتا۔ ”پیارے تو بھی جلوہ دیکھ لے“ کیا یاد کرے گا۔“ اور پنکج ملک کی آواز اپنی لے اور گھوڑے کی ٹاپ کی تال پر ”جگ میں چلے پون کی چال“ گاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ مرزا کہتے تھے کہ یہ شخص پچھلے جنم میں گھوڑا تھا اور اگلے جنم میں بھی گھوڑا ہی ہو گا۔ یہ سعادت صرف مہاتماؤں اور رشیوں منیوں کو حاصل ہوتی ہے کہ جو وہ پچھلے جنم تھے، اگلے میں بھی وہی ہوں۔ ورنہ ہما شما کی تو ایک ہی دفعہ میں جون پلٹ جاتی ہے۔

○ دستِ بدایوارِ والِ گیا

گھوڑے تانگے کا افتتاح کئے، مہورت کئے، Breaking-in کئے۔ اس کی رسم بشارت کے والد نے انجام دی۔ ستر کے پیٹے بلکہ لپیٹے میں آنے کے بعد مستقل بیمار رہنے لگے تھے۔ کراچی آنے کے بعد انہوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر نہ کوئی مکان اور جائیداد الاٹ کرا سکے، نہ کوئی ڈھنگ کی بزنس شروع کر پائے۔ بنیادی طور پر وہ سیدھے آدمی تھے۔ بدلے ہوئے حالات میں بھی وہ اپنے بندھے نکلے اصولوں اور آؤٹ آف ڈیٹ طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کو سراسر بدمعاشی گردانتے تھے۔ چنانچہ ناکامی سے دل گرفتہ یا شرمسار ہونے کی بجائے ایک گونہ افتخار و طہانیت محسوس کرتے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو زندگی میں ناکام ہونے کو اپنی نیکی اور راست بازی کی سب سے روشن دلیل سمجھتے ہیں۔ بے حد حساس، کم آمیز اور خود دار انسان تھے۔ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا یا تھا۔ پامٹ کے سامنے بھی نہیں۔ اب یہ بھی کیا، خوشامد سے زبان کو کبھی آلودہ نہیں کیا تھا۔ یہ قسم بھی ٹوٹی مگر کارِ برآری نہیں ہونی تھی، نہ ہوئی۔ بقول مرزا عبدالودود بیگ، جب غیور اور با اصول آدمی حتی المقدور دھکے کھانے کے بعد ”ڈی موریلائرز“ ہو کر کامیاب لوگوں کے ہتھکنڈے اپنانے کی بھونڈی کوشش کرتا ہے تو رہی

سہی بات اور بگڑ جاتی ہے۔ یکایک ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہو گیا۔ ذیابیطس، الرجی، پارکنسن کا عارضہ اور اللہ جانے کیا کیا لاحق ہو گیا۔ کچھ نے کہا، ان کی مجروح اٹا نے بیماریوں میں پناہ تلاش کر لی ہے۔ خود تندرست نہیں ہونا چاہتے کہ پھر کوئی ترس نہیں کھائے گا۔ اب انہیں اپنی ناکامی کا اتنا ملال نہیں تھا جتنا کہ عمر بھر کی وضعرداری کے ہاتھ سے چھوٹے کا قلق۔ لوگ آ آ کر انہیں حوصلہ دلاتے اور کامیاب ہونے کی ترکیبیں بجاتے تو ان کے آنسو رواں ہو جاتے۔

تم تو کرو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں
 سبکی، بے وقری اور ذلت کی سب سے ذلیل صورت یہ ہے
 کہ آدمی خود اپنی نظر میں بے وقعت و بے توقیر ہو جائے۔
 سو وہ اس جہنم سے گزرے۔

جاننا نہ تھا جہاں مجھے سو بار واں گیا
 ضعف قویٰ سے دست بدیوار واں گیا
 محتاج ہو کے ناں کا طلبگار واں گیا
 چاہہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا
 اس جان ناتواں پہ کیا صبر اختیار

دور پر ہر اک دنی کے سماجت مری گئی
 نالائقوں سے ملتے لیاقت مری گئی
 کیا مفت ہائے شان شرافت مری گئی
 ایسا پھرایا اس نے کہ طاقت مری گئی
 مشہور شہر اب ہوں سبک سار و بے وقار

بشارت بیان کرتے ہیں کب باوا جب ”دست بدیوار“ والا مصرع پڑھتے تو ہوا میں دائیں ہاتھ سے دیوار پکڑ پکڑ کر چلنے کی تصویر سی کھینچ دیتے۔ بایاں بے جان ہاتھ لٹکا الگ اپنی بات تصویر کہانی سناتا۔ لیکن بے کسی اور بے بسی کی تصویر کھینچنے کے لیے انہیں کچھ زیادہ کاوش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ساری عمر داغ کی غزلوں پر سر دھنا کئے۔ انہوں نے کبھی کسی طوائف کو فانی یا میر کی غزل گاتے نہیں سنا۔ دراصل ان دنوں محفل رقص و سرود میں کسی شعلہ رو، شعلہ گلو سے فانی یا میر کی غزل گوانا ایسا ہی تھا جیسے شراب میں برابر کا نیبو کا رس نچوڑ کر پینا پلانا! گستاخی معاف، ایسی، مئے مرد اقلن، پینے کے بعد تو آدمی صرف طبلہ بجانے کے لائق رہ جائے گا۔ تو صاحب، باوا ساری عمر فانی اور میرے نفور رہے۔ اب جو پناہ ملی تو انہیں کے ابیات میں ملی۔ وہ قوی اور بہادر آدمی تھے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی ان کو روتے ہوئے دیکھوں گا۔ مگر دیکھا۔ ان آنکھوں سے اکثر۔“

کراچی میں ان کا آدھا وقت تو یارانِ رفتہ کی یاد میں گزرتا تھا۔ بقیہ آدھا یارانِ ازکارِ رفتہ ضائع کر دیتے تھے۔

○ الہ دین ہشتم

بزرگوار کے امراض نہ صرف متعدد تھے بلکہ متعدی بھی۔ ان میں سب سے موذی مرض بڑھاپا تھا۔ ان کا ایک داماد ولایت سے سرجری میں تانا تانا ایف آر سی ایس کر کے آیا تھا۔ اس نے اپنی سسرال میں کسی کا اپنڈکس سلامت نہیں چھوڑا۔ کسی کی آنکھ میں بھی تکلیف ہوتی تو اس کا اپنڈکس نکال دیتا تھا۔ حیرت اس پر ہوتی کہ آنکھ کی تکلیف جاتی رہتی تھی۔ بزرگوار حالانکہ تمام عمر دردِ شکم میں مبتلا رہے، لیکن اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ کہتے تھے کہ میں نے آج تک کسی ڈاکٹر کو اپنے اپنڈکس پر ہاتھ

نہیں ڈالنے دیا۔ ایک مدت سے صاحب فراش تھے۔ لیکن ان کی معذوری ابھی نامکمل تھی۔ مطلب یہ کہ سارے سے چل پھر سکتے تھے۔ انہوں نے رسم افتتاح اس طرح ادا کی کہ اپنے کمرے کے دروازے میں جس سے نکلے انہیں کئی مہینے ہو گئے تھے، ایک سرخ رن بندھوا کر اپنے ڈانواں ڈول ہاتھ سے قینچی سے کاٹی۔ تالی بجانے والے بچوں میں لڈو تقسیم کرنے کے بعد دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ پھر گھوڑے کو اپنے ہاتھ سے گیندے کا ہار پہنایا۔ اس کی پیشانی پر ایک بڑی سی بھوڑی تھی۔ زعفران میں انگلی ڈبو کر اس پر ”اللہ“ لکھا اور کچھ پڑھ کر دم کیا۔ چاروں سہلوں اور دونوں پہیوں شگون کے لیے سیندور لگا کر دعا دی کہ جیتے رہو، سدا سر پٹ چلتے رہو۔ رحیم بخش کوچوان کا منہ کھلوا کے اس میں سالم لڈو فٹ کیا۔ خود ورق نقرہ میں لپٹی ہوئی گلدوری کلے میں دبائی۔ پرانی کشمیری شال اوڑھ لپیٹ کے تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور اگلی سیٹ پر اپنا بیس سال پرانا ہارمونیم رکھوا کر اس کی مرمت کرانے ماسٹر باقر علی کی دکان روانہ ہو گئے۔

گھوڑے کا نام بدل کر بزرگوار نے بلبن رکھا۔ کوچوان سے کہا، ہمیں تمہارا نام رحیم بخش بالکل پسند نہیں۔ ہم تمہیں الہ دین کہہ کر پکاریں گے۔ جب سے ان کا حافظہ خراب ہوا تھا وہ ہر نوکر کو الہ دین کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ الہ دین ہشتم تھا۔ اس کا پیش رو الہ دین ہفتم کثیر العیال تھا۔ حقے کے تمباکو اور روٹیوں کی چوری میں نکلا گیا۔ گرم روٹیاں پیٹ پر باندھ کر لے جا رہا تھا۔ چال سے پکڑا گیا۔ بزرگوار موجودہ الہ دین یعنی رحیم بخش کو عام طور سے الہ دین ہی کہتے تھے۔ البتہ کوئی خاص مثلاً پیر دیوانے ہوں یا بے وقت چلم بھروانی ہو یا محض پیار اور شفقت جتانی ہو تو الہ دین میاں کہہ کر پکارتے۔ لیکن گالی دینی ہو تو اصل نام لے کر گالی دیتے تھے۔

دوسرے دن سے تا نگہ صبح بچوں کو اسکول لے جانے لگا۔ اس کے بعد بشارت کو دکان چھوڑنے جاتا۔ تین دن یہی معمول رہا۔ چوتھے دن کوچوان بچوں کو اسکول چھوڑ کر واپس آیا تو بے حد پریشان تھا۔ گھوڑا پھانک سے باندھ کر سیدھا بشارت کے پاس آیا۔ ہاتھ میں چابک اس طرح اٹھائے ہوئے تھا جیسے زمانہ قدیم میں علمبردار جنگی علم لے کر چلتا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے، جس طرح نیویارک کے اسٹیچو آف لبرٹی نے اپنے ہاتھ کو آخری سینٹی میٹر تک اونچا کر کے مشعل آزادی بلند کر رکھی ہے۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ کوئی بھگوگ پڑ جائے یا منحوس خبر سنائی ہو تو وہ اسی طرح چابک کا علم بلند کئے آتا تھا۔ چابک کو عمودی حالت میں دیکھ کر بشارت ایسے سراسیمہ ہوتے جیسے ہیلمیٹ Ghost دیکھ کر ہوتا تھا۔

Here it cometh, my lord!

بشارت کے قریب آ کر اس نے چابک کو ”ہاف ماسٹ“ کیا اور پندرہ روپے طلب کئے۔ کہنے لگا؟ ”اسکول کی گلی کی ٹکڑ پہ اچانک چالان ہو گیا۔ گھوڑے کے بائیں پاؤں میں لنگ ہے! اسکول سے نکلا ہی تھا کہ ”بے رحمی والوں“ نے دھر لیا۔ بڑی منتوں سے پندرہ روپے دے کر گھوڑا چھڑایا ہے۔ ورنہ اس کے ساتھ سرکار بھی بے فضول کھچے کھچے پھرتے۔ میری آنکھوں کے سامنے بے رحمی والے ایک گدھا گاڑی کے مالک کو چابک سے مارتے ہوئے ہنگال کے تھانے لے گئے۔ اس کے گدھے کا لنگ تو اپنے گھوڑے کا پاسنگ بھی نہیں۔“ کوچوان نے گدھے کے خفیف سے لنگ کا ذکر اتنی حقارت سے کیا اور اپنے گھوڑے کے لنگ کی شدت اور برتری بیان کرنے میں اتنے فخر اور غلو سے کلام لیا کہ بشارت نے غصے سے کانپتے ہوئے ہاتھ سے پندرہ روپے دے کر اسے خاموش کیا۔

○ شیر کی نیسے اور بکری کی عقل میں فتور

اسی وقت ایک سلوتری کو بلا کر گھوڑے کو دکھایا۔ اس نے بائیں ٹی ہاتھ سے سونتی تو گھوڑا چمکا۔ تشخیص ہوئی کہ پرانا لنگ ہے۔ سارا گھپلا اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا۔ غالباً کیا یقیناً اسی وجہ سے گھوڑا ریس میں ڈس کوالیفائی ہوا ہو گا۔ ایسے گھوڑے کو تو اسی وقت گولی مار دی جاتی ہے جو اس کے حق میں تانگے میں ذلیل و خوار ہونے سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ تاہم سلوتری نے امید دلائی کہ لنگ اس صورت میں دور ہو سکتا ہے کہ چھ مہینے تک حواصل کے تیل کی مالش کرائیں۔ مالش کی اجرت پانچ روپے یومیہ یعنی ڈیڑھ سو روپے ماہوار، چھ مہینے کے نو سو روپے ہوئے۔ نو سو کا گھوڑا، نو سو کی مالش۔ گویا ٹاٹ کی گدڑی میں کنوَاب کا پیوندا ابھی کچھ دن ہوئے انہوں نے اپنے والد کی مالش اور پیر دبانے کے لیے ایک شخص کو اسی روپے ماہوار پر رکھا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان کی کمائی کا نصف حصہ تو انکم ٹیکس والے دھروا لیں گے اور ایک تہائی چپی مالش والے کھا جائیں گے۔ حلال کی کمائی کے بارے میں انہوں نے کبھی نہیں سنا تھا کہ وہ اس تناسب سے غیر مستحقین میں تقسیم ہوتی ہے۔

چار بجے تانگہ جوتا کر سیٹھ سے نمٹنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ تانگے میں بیٹھنے سے پہلے انہوں نے گہرے رنگ کی دھوپ کی عینک لگا لی تا کہ سخت بات کہنے میں حجاب محسوس نہ ہو اور چہرے پر ایک پر اسرار خونخواری کا ایکسپریشن آ جائے۔ آدھا راستہ ہی طے کیا ہو گا کہ ایک شخص نے بم پکڑ کر تانگہ روک لیا۔ کہنے لگا، آپ کا گھوڑا بری طرح لنگڑا رہا ہے، چالان ہو گا۔ بشارت ہک دک رہ گئے۔ معلوم ہوا ”بے رحمی والے“ آج کل بہت سختی کر رہے ہیں۔ ہر موڑ پر ایک انسپکٹر گھات میں کھڑا ہے۔ قدم قدم پہ بات بے بات چالان ہو رہا ہے۔ وہ کسی طرح نہ مانا تو بشارت نے قانونی موشگافی کی، آج صبح ہی اس کا چالان ہو چکا ہے۔ سات گھنٹے میں ایک ہی جرم میں دو چالان نہیں ہو سکتے۔ انسپکٹر نے یہ بات بھی فرد جرم میں ٹانک لی اور کہا کہ اس سے تو جرم کی نوعیت اور سنگین ہو گئی۔ کوئی جائے فرار نظر نہ آئی تو بشارت نے کہا۔ ”اچھا“

بابا! تمہیں سچے سچی دس روپے پہ معاملہ رفع دفع کرو۔ برانڈ نیو گھوڑا ہے۔ خریدے ہوئے تیسرا دن ہے۔" یہ سنتے ہی وہ شخص تو آگ بگولا ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "بڑے صاب! گالز کے باوجود آپ بھلے معلوم ہوتے ہیں مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ پیسے سے لنگڑا گھوڑا خرید سکتے ہیں، آدمی نہیں خرید سکتے۔" چلان ہو گیا۔

اسٹیل ری رولنگ مل پہنچے تو سیٹھ گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آج اس کے یہاں ایک بزرگ کی نیاز میں ڈیڑھ دو سو فقیروں کو پلاؤ کھلایا جا رہا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اس سے مینے بھر کی کمائی پاک ہو جاتی ہے۔ اور یہ Laundering (شست و شو) کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک بینک میں پندرہ بیس برس تک یہ دستور رہا کہ ہر برانچ میں روزانہ جتنے نئے اکاؤنٹ کھلتے، شام کو اتنے ہی فقیر کھائے جاتے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کھانا اکاؤنٹ کھلنے کی خوشی میں کھلایا جاتا تھا یا سودی کاروبار میں بڑھوتری کا کفارت تھا۔ ہمیں ایک مرتبہ ملتان جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اس دن بینک کے مالکان میں سے ایک بہت سینئر سیٹھ انپکشن پر آئے ہوئے تھے۔ شام کو برانچ میں مساوات کا یہ ایمان افروز منظر دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ سیٹھ صاحب پندرہ بیس فقیروں کے ساتھ زمین پر اکڑوں بیٹھے پلاؤ کھا رہے ہیں اور فرداً فرداً ہر فقیر اور اس کے اہل و عیال کی عدم خیریت کی تفصیلات دریافت کر رہے ہیں۔ لیکن مرزا عبدالودود بیگ کو غبارے پتھر کرنے کی بڑی بری عادت ہے۔ انہوں نے یہ کہہ کر ہماری ساری خوشی کرکری کر دی کہ جب شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پانی پینے لگیں تو سمجھ لو کہ شیر کی نیت اور بکری کی عقل میں فوار ہے۔ محمود و ایاز کا ایک ہی صف میں بیٹھ کر پلاؤ کھانا بھی "آؤٹ اینڈ انپکشن" کا حصہ ہے۔ سیٹھ صاحب دراصل یہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ کھانے والے اصلی فقیر ہیں یا مینجر نے اپنے یاروں، رشتے داروں کی پنگت بٹھا دی ہے۔

ہم کہاں سے کہاں آ گئے۔ ذکر اسٹیل مل والے سیٹھ کا تھا جو سات آٹھ سال سے کالے دھن کو ماہ بہ ماہ نیاز فاتحانہ کے لوہان کی دھونی سے پاک اور "وہاٹ" کرتا رہتا

تھا۔ نئی جادوئی چھڑی ایجاد ہونے میں ابھی کئی دیر تھی کہ ہمارے ذہن اور طباع وزیر خالی خزانہ اور ماہرین اقتصادیات تو اس زمانے میں میٹرک کے امتحان کی تیاری میں لگے ہوں گے۔ لہذا سیاہ کو سفید کرنے کا شعبہ ہنوز پیر فقیر، نو سر باز، سفلی عامل اور باورچی خانے پر سفید کرنے والے انجام دیتے تھے۔

○ مہاتما بدھ ہماری تھے

سیٹھ نے گھوڑے کے لنگ سے قطعی لا علمی کا اظہار کیا۔ الٹا سر ہو گیا کہ ”تم گھوڑے کو دیکھنے ہاف ڈزن ٹائم تو آئے ہو گے۔ گھوڑا تلمک تم کو پہچاننے لگا تھا۔ دس دفعہ گھوڑے کے دانت گئے۔ کیا؟ تم ایک دفعہ اس کے لیے نان خطای بھی لائے۔ تم نے ہم کو یہاں تلمک بولا کہ گھوڑا نو ہاتھ لمبا ہے۔ اس سے تمہیں یہ نوگزا دکھائی پڑتا تھا۔ آج چار پانچ دن بعد گھوڑے کے گالز خود پہن کے بہتان طوفان لگانے آئے ہو‘ کیا؟ تین دن میں تو قبر میں مردے کا بھی حساب کتاب برور خلاص ہو جاتا ہے۔ اس ٹیم آپ کو مال میں یہ ڈیلکٹ دکھائی نہیں پڑا۔ تانگے میں جوت کے غریب خانے

لے گئے تب بھی نجر نہیں آیا۔“ بشارت سیٹھ کے سامنے اپنے گھر کو اتنی دفعہ غریب خانہ کہہ چکے تھے کہ وہ یہ سمجھا کہ یہ ان کے گھر کا نام ہے۔

بشارت نے کچھ کہنا چاہا تو قطع کلام کرتے ہوئے بولا۔ ”ارے بابا! گھوڑے کا کوئی پارٹ کوئی پر نہ ایسا نہیں جس پہ تم نے دس دس دفعہ ہاتھ نہیں پھیرا ہو۔ کیا؟ تم بزنس مین ہو کے ایسا کچی بات منہ سے نکالیں گا یا تو ہم کدھر کو جائیں گے؟ بولونی! ہلکٹ مانس (گھٹیا آدمی) کے موافق بات نہیں کرو۔ کیا؟“ سیٹھ بری الذمہ ہو گیا۔

بشارت نے زچ ہو کر کہا۔ ”حد تو یہ کہ سودا کرنے سے پہلے یہ بھی نہ بتایا کہ گھوڑا جنانہ الٹ چکا ہے۔ آپ خود کو مسلمان اور پاکستانی کہتے ہیں!“

(سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) ”تو کیا تمہارے کو بدھٹ دکھائی پڑتا ہوں؟ ہم نے جونا گڑھ کاٹھیا واڑ سے مائی گریٹ کیا ہے۔ کیا؟ اپنے پاس برویر سندھ کا ڈومینائل ہے۔ مہاتما بدھ تو ہماری تھا۔ (اپنے منہ میں پان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میرے منہ میں رنق ہے۔ تم بھی بچوں کی قسم کھا کے بولو۔ جب تم سے پوچھا گھوڑا کائے کو بیچ رہے ہو، ہم نے بھی الپھور (فی الفور) بول دیا۔ سووا پکا کرنے سے پہلے پوچھتے تو ہم پہلے بول دیتے۔ تم لکڑی بیچتے ہو تو کیا گراہک کو لکڑی کی ہر گانٹھ، ہر داغ پہ انگلی رکھ رکھ کے بتاتے ہو کہ پہلے اسے دیکھو؟ ہم سلا اپنا بیچ بیوپار کرے کہ تمہارے کو گھوڑے کی بیا گرا بھی (بائیو گرافی) بتائے۔ قادر میرے کو ہمیش بولتا تھا کہ گراہک ۴۲۰ ہو تو پہلے دیکھو بھالو۔ پھر سودے کی ٹیم بولو کم، تو لو زیادہ۔ پر تمہارے اوپر تو کھولو، ابھی کھولو، کی دھن سوار تھی۔ تمہارے منہ میں پیسے بیج رہے تھے۔ گجراتی میں کہاوت ہے کہ پیسہ تو شیرنی کا دودھ ہے۔ اسے حاصل کرنا اور ہجم کرنا دونوں برویر مشکل ہیں۔ پر تم تو سلا شیر کو ہی دوہنا مانگتا ہے۔ ہم کروڑوں کا بیجنس کریلا ہے۔ آج دن تلک جبان دے کے نہیں پھرے۔ اچھا، اگر تم قرآن اٹھا کے بول دو کہ تم گھوڑا خریدتے ٹیم پنے لا (پیسے ہوئے) تھا تو ہم فوراً ایک ایک پائی ری پھنڈ (ری فنڈ) کر دیں گا۔“

بشارت نے گڑگڑاتے ہوئے درخواست کی۔ ”سیٹھ، سو ڈیڑھ سو کم میں گھوڑا واپس لے لو، میں عیال دار آدمی ہوں تا عمر ممنون و احسان مند رہوں گا۔“

سیٹھ آپے سے باہر ہو گیا۔ ”ارے بابا! خچر کے موافق ہم سے اڑی نہیں کرو، ہم سے ایک دم کڑک اردو میں ڈانیلاگ مت بولو۔ تم پھلم کے ولن کے موافق گاگلز لگا کے ادھر کائے کو تڑی دیتا پڑا ہے۔ بھائی صاحب! تم پڑھیلا مانس ہو، کوئی پھڈے باز موالی، لمباری نہیں جو شریہوں سے دادا گیری کرے۔ تم نے سائن بورڈ نہیں پڑھا۔ بابا یہ ری رولنگ مل ہے، اسٹیل ری رولنگ مل۔ ادھر گھوڑوں کا دھندا نہیں ہوتا۔ کیا؟ کل کو تم بولیں گا کہ تانگہ بھی واپس لے لو۔ ہم سلا اکھا (تمام) عمر ادھر بیٹھا گھوڑے

تانگے کا دھندا کریں گا تو ہمارا فیملی پر یوار کیا گھر میں بیٹھا قوالی کریں گا؟ بھائی صاحب! اپن کا گھر تو گریہتوں کا گھر ہے۔ کسی بزرگ کا مجاہر نہیں کہ بائی لوگ گج گج بھر لے بال کھولے دھمال ڈال دیں۔ دھما دھم مت قلندر“

بشارت نے تانگہ اسٹیل ری رولنگ مل کے باہر کھڑا کر دیا اور خود ایک تھڑے پر پیر لٹکائے انتظار کرنے لگا کہ اندھیرا ذرا گہرا ہو جائے تو واپس جائیں تا کہ نو گھنٹے میں تیسری مرتبہ چالان نہ ہو۔ غصے سے ابھی تک ان کے کان کی لوہیں تپ رہی تھیں اور حلق میں کیکنس اگ رہے تھے۔ بلبن گولڈ مر کے پیڑ سے بندھا سر جھکائے کھڑا تھا۔ انہوں نے پان کی دکان سے ایک لیمونڈ کی گولی والی بوتل خریدی۔ ایک ہی گھونٹ میں انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کے انتظار میں یہ بوتل کئی مہینوں سے دھوپ میں تپ رہی تھی۔ پھر یک لخت یاد آیا کہ اس افراتفری میں آج دوپہر بلبن کو چارا اور پانی بھی نہیں ملا۔ انہوں نے بوتل ریت پر اندیل دی۔ اور گاگلز اتار دیئے۔

○ باوجود دھر لیا

تانگہ لاشتم پشتم چلا رہا۔ رحیم بخش اس کے بعد تین چار دفعہ اور دھر لیا گیا لیکن بات سات آٹھ روپے پر ٹل گئی۔ دس پندرہ دن کا بھلاوا دے کر ایک دن پھر چابک بلند کئے آیا۔ کہنے لگا۔ ”سرکارا باوجود دھر لیا۔ ہر چند کہ آج میرے پاس نانواں نہیں تھا، مگر بہت منہ پھاڑا ہے۔ پیچیس مانگتا ہے۔ چنانچہ تانگہ اس کے پاس گروی رکھ کے آیا ہوں۔ اگرچہ بچے تانگے میں بمعہ گھوڑے کے ہیں۔ آپ ہر دفعہ سمجھتے ہیں کہ رحیم بخش ڈیامہ کھیل یا ہے۔ چنانچہ خود چل کے چھڑا لیجئے۔ اگرچہ زحمت.....“

بشارت اس وقت اکڑوں بیٹھے ایک دغیلے تختے کی گرہ کا معائنہ کر رہے تھے۔ یک لخت بھڑک کے اٹھ کھڑے ہوئے اور تو کسی پہ بس چلا نہیں، بری خبر لانے والے کے ہاتھ سے چابک چھین کر اسے تڑ سے زمین پر مارتے ہوئے کہنے لگے۔ ”ہر چند کہ بچے!

اگر تو نے آئندہ میرے سامنے باوجود اگرچہ اور چنانچہ کیا تو اسی چابک سے چمڑی ادھیڑ
 دوں گا۔"

دوران سرزنش رحیم بخش نے یکایک اپنا بایاں کلن بلایا تو بشارت کو اپنی آنکھوں پر یقین
 نہیں آیا۔ غصے کو لاجول اور ایک گلاس پانی سے بجھا کر، چابک ہاتھ میں لیے وہ رحیم
 بخش کے ساتھ ہو لیے کہ آج جھوٹے کو گھر تک پہنچا کر ہی دم لیں گے۔ جائے
 واردات پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک "بے رحمی والا" سچ مچ گھوڑے کی راس تھامے کھڑا
 ہے۔ بچے گلے میں بستے اور تھرمس لٹکائے، دھوپ میں سے کھڑے ہیں۔ یہ منظر دیکھ
 کر ان کے خون کی کھولن یکبارگی نقطہ انجماد پر اتر آئی۔ گلے میں اون کا گولا سا
 اٹکا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ چابک کا سارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ "بے رحمی والے"
 کو علیحدہ لے جا کر انہوں نے رحم کی اپیل کی۔ اور اپنے مخصوص دکاندارانہ انداز میں
 اس پہلو پر بھی توجہ دلائی کہ ہم تو آپ کے مستقل کلائنٹ ہیں، اٹھاؤ چولہا پاوندے
 نہیں کہ آج ہیں کل نہیں۔ اس نے بیس روپے کا ڈسکاؤن دے کر صرف پانچ روپے
 میں معاملہ رفع دفع کر دیا۔

اسی اثناء میں "بے رحمی کا ہفتہ" جو اکیس دن تک منایا گیا، شروع ہو گیا۔ جب تک
 وہ بلا خیر و خوبی ختم نہ ہو گیا، گھوڑا، سلوتری اور رحیم بخش تینوں بالترتیب بندھے، کھڑے
 اور چھٹے کھاتے رہے۔ رحیم بخش کو گھوڑے کے ساتھ بریکٹ کرنا یوں بھی ضروری
 ہو گیا کہ اس کی خوراک گھوڑے سے کسی طرح کم نہ تھی۔ گھوڑے کو تو خیر تیسرے
 چوتھے روز بد ہضمی ہوتی رہتی تھی لیکن رحیم بخش کا نظام ہضم نہ صرف ہر قسم کے
 بیکٹریا سے بلکہ مقدار سے بھی Immune ہو گیا تھا۔ نئے Pet، نئی نوپلی دلہن اور لاڈلے
 بچے کے ساتھ شفقت کا اظہار کرنے کا ہمارے ہاں لے دے کے ایک ہی طریقہ ہے۔
 وہ یہ کہ ہر شخص انہیں کچھ نہ کچھ کھلا کر اوور فیڈ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ گھوڑے
 کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ نتیجتاً اسے بار بار رجمنڈ کر افورڈ ہسپتال (جانور کا اسپتال) بھیجنا

پڑتا۔ بشارت کا بیان ہے کہ ایک دن شام کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ رحیم بخش گھوڑے کے جلاب کا سارا پاؤڈر پھٹکے مار کے کھا گیا۔

”ہفتہ“ ختم ہوتے ہی بچوں کو پھر مانگے میں بھیجنا شروع کر دیا۔ ان کی اپنی دکان زیادہ دور نہیں تھی، لہذا پیدل چلے جاتے تھے۔ تین ہفتے خیریت سے گزرے۔ مطلب یہ کہ گھوڑے کا لنگ بڑھ گیا، مگر چالانوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ چوتھا ہفتہ شروع ہی ہوا تھا کہ رحیم بخش چابک کا علم اٹھائے، آہ و بکا کرتا، بائیں ٹانگ سے لنگڑاتا آیا۔ گھوڑے کی دیکھا دیکھی اب وہ بائیں ٹانگ سے لنگڑانے لگا تھا۔ کہنے لگا۔ ”سرکار! آج پھر دھر لیا۔ آگاہ کئے بغیر ناگاہ دھر لیا۔ چنانچہ بیس روپے بھر کے آ رہا ہوں۔ اگرچہ میں نے بہترے ٹھڈی میں ہاتھ دیے۔“ بشارت نے بادست ناخواست بیس روپے اس کے منہ پر مارے۔ اب جو تاہز توڑ چالان ہونے شروع ہوئے تو چوٹ سہلانے تک کی مہلت نہ ملی۔ انہوں نے رحیم بخش کو سختی سے ہدایت کی کہ چھپ چھپا کر راستے بدل بدل کر گلیوں گلیوں جایا کرے۔ اس وضع احتیاط میں اس نے اپنی طرف سے اتنا اضافہ اور کر لیا کہ خود بھی چھپ کر یعنی سر سے پیر تک ایک لال کھیس اوڑھ کے تانگہ چلانے لگا۔ گھونگٹ میں سے صرف اس کا سگریٹ باہر نکلا رہتا تھا۔ لیکن اس سے واقعی بڑا فرق پڑا۔ وہ اس طرح کہ انپکڑ اب گھوڑے کو پہچانے بغیر ہی دور سے صرف لال کھیس دیکھ کر چالان کر دیتا تھا۔

○ بزرگوار کی حکمت عملیات سے

رشوت اور مالش کی مجموعی رقم اب گھوڑے کی قیمت اور ان کی قوت برداشت سے تجاوز کر چکی تھی۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتا تھا۔ عاجز آ کر انہوں نے رحیم بخش کی زبانی انپکڑ کو یہ تک کہلایا کہ تم میری دکان میں اگاہی کے کام

پر ملازم ہو جاؤ۔ موجودہ تنخواہ سے زیادہ دوں گا۔ اس نے کہلا بھیجا۔ ”سیٹھ کو میرا سلام بولنا اور کہنا کہ ہم تین ہیں۔“

انہوں نے گھوڑا تانگہ بیچنا چاہا تو کسی نے سو روپے بھی نہ لگائے۔ بالآخر اس پریشانی کا ذکر اپنے والد بزرگوار سے کیا۔ انہوں نے احوال سن کر فرمایا۔ ”اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم دعا کریں گے۔ تانگے میں جوتے سے پہلے ایک گلاس دم کیا ہوا دودھ پلا دیا کرو۔ اللہ نے چاہا تو لنگ جاتا رہے گا اور چالانوں کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔ ایک دفعہ وظیفے کا اثر تو دیکھو۔“

بزرگوار نے اسی وقت رحیم بخش سے بستر پر ہارمونیم منگوایا۔ وہ دھونکی سے ہوا بھرتا رہا اور بزرگوار کانپتی، کپکپاتی آواز میں حمد گانے لگے۔

ترے ہاتھ میں ہے فنا بقا، تری شان جل جلالہ،
تری شان جل جلالہ،

آنکھ جہاں پڑتی وہاں انگلی نہیں پڑ رہی تھی۔ اور جس پردے پر انگلی پڑتی، اس پر پڑی ہی رہ جاتی۔ ایک مصرع گانے اور بجانے کے بعد یہ کہہ کر لیٹ گئے کہ اس ہارمونیم کے کالے پردوں کے جوڑ جکڑ گئے ہیں۔ ماسٹر باقر علی نے خاک مرمت کی ہے۔ دوسرے دن بزرگوار کی چارپائی ڈرائنگ روم میں آگئی۔ اس لیے کہ یہی ایک ایسا کمرہ تھا جہاں گھوڑا علی الصبح اپنے ماتھے پر ”اللہ“ لکھوانے اور دم کروانے کے لیے اندر لایا جا سکتا تھا۔ صبح تڑکے بزرگوار نے دو نفوں کے بعد عرق گلاب میں انگلی ڈبو کر گھوڑے کی پیشانی پر اللہ لکھا اور سموں کو لوہان کی دھونی دی۔ کچھ دیر بعد اس پر ساز کسا جانے لگا تو بشارت دوڑے دوڑے بزرگوار کے پاس آئے اور کہنے لگے، گھوڑا دم کا دودھ نہیں پی رہا۔ بزرگوار متعجب ہوئے۔ پھر آنکھیں بند کر کے سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحوں بعد انہیں نیم وا کر کے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں۔ کوچوان کو پلا دو۔ گھوڑا وجع الانسان میں مبتلا ہے۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ دم کا دودھ رحیم بخش نوش جان کرنے لگا۔ بظاہر ایسی کراہت سے پیتا جیسے اس زمانے میں یونانی دواؤں کے قدحے پیئے جاتے

تھے۔ یعنی ناک پکڑ کے 'منہ بنا بنا کے۔ اللہ شافعی! اللہ شافعی! (نعوذ باللہ) کہتا جاتا۔ دودھ کے لیے نہ جانے کہاں سے دھلت کا بہت لمبا گلاس لے آیا جو اس کی ناف تک پہنچتا تھا۔ بزرگوار کی عملیاتی تدابیر کا اثر پہلے ہی دن ظاہر ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ اس دن چالان ایک داڑھی والے نے کیا۔ رحیم بخش اپنا لہراتا ہوا چابک ہاف ماسٹ کر کے کہنے لگا۔ "سرکار" باوجود دھر لیا۔" پھر اس نے قدرے تفصیل سے بتایا کہ ایک داڑھی والا آج ہی جمشید روڈ کے حلقے سے تبدیل ہو کے آیا ہے۔ بڑا ہی رحمدل! اللہ والا آدمی ہے۔ چنانچہ صرف ساڑھے تین روپے لیے۔ وہ بھی بطور چندہ۔ پڑوس میں ایک بیوہ کے بچے کے علاج کے لیے۔ آپ چاہیں تو چل کے ملاقات کر لیں۔ مل کے بہت خوش ہوں گے۔ ہر وقت منہ ہی منہ میں وظیفہ پڑھتا رہتا ہے۔ اندھیری رات میں سجدے کے گئے سے ایسی روشنی نکلتی ہے کہ سوئی پرو لو۔ (اپنے بازو سے تعویذ کھولتے ہوئے) گھوڑے کے لیے یہ تعویذ دیا ہے۔

کہاں پچیس روپے' کہاں ساڑھے تین روپے! بزرگوار نے رشت میں کمی کو اپنے وظیفے اور کشف و کرامات پر محمول کیا اور فرمایا کہ تم دیکھتے جاؤ۔ انشاء اللہ چالیسویں دن "بے رحمی" کے انسپکٹر کو گھوڑے کی ٹانگ نظر آنی بند ہو جائے گی۔ بزرگوار کی چارپائی کے گرد ان کا ساز و سامان بھی ڈرائنگ روم میں قرینے سے سجا دیا گیا۔ دوائیں 'بیڈ پین' حقہ 'سلطانی' ہارمونیم' آغا حشر کے ڈرامے' مولانا آزاد کے "الہلال" کے مجلد فائل' انہما کے آلات اور کچن ایکٹرس کی تصویر۔ ڈرائنگ روم اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس میں گھوڑے اور بزرگوار اور ہر دو کا فضلہ اٹھانے والی مہترانی کے علاوہ کوئی اور پانچ منٹ بھی ٹھہر سکے۔ بشارت کے دوستوں نے آنا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ گھوڑے کی خاطر بزرگوار کو برداشت کر رہے تھے۔

○ ایک گھوڑا بھرے گا کتنے پیسے؟

جس دن سے داڑھی والے مولانا تعینات ہوئے، رحیم بخش ہر چوتھے پانچویں دن آ کے سر پہ کھڑا ہو جاتا۔ ”چندہ دیجئے۔“ لیکن ڈھائی تین روپے یا زیادہ سے زیادہ پانچ میں آئی بلا ٹل جاتی۔ اس سے جرح کی تو معلوم ہوا کہ کراچی میں تانگے اب صرف اسی علاقے میں چلتے ہیں۔ تانگے والوں کا حال گھوڑوں سے بھی خستہ ہے۔ انہوں نے پولیس اور بے رحمی والوں کا برائے نام ماہانہ باندھ رکھا ہے جو ان کی گزر بسر کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ ادھر ننگے بھوکے گدھا گاڑی والے مکرانی سر پھاڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ زخمی گدھا، پسینے میں شرابور گدھا گاڑی والا اور پھٹے حالوں ”بے رحمی“ کا انپکٹر..... یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں کون زیادہ خستہ اور مظلوم ہے۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے ایک سوکھی بھوکی جونک دوسری سوکھی بھوکی جونک کا خون پینا چاہے۔ نتیجہ یہ کہ بے رحمی والے پو پھٹے ہی اکلوتی موٹی اسامی یعنی ان کے تانگے کے انتظار میں گلی کی ککڑ پہ کھڑے ہو جاتے اور اپنے پیسے کھرے کر کے چل دیتے۔ اکیلا گھوڑا سارے عملے کے بال بچوں کا پیٹ پال رہا تھا۔ لیکن کرامت حسین (داڑھی والے مولانا کا یہی نام تھا) کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ وہ اپنے حلیے اور پھٹے حالوں سے اتنے مسکین لگتے تھے کہ محسوس ہوتا تھا گویا انہیں رشوت دینا کارِ ثواب ہے اور وہ رشوت لے کر در حقیقت رشوت دینے والے کو داخلِ حسنت کر رہے ہیں۔ وہ رشوت مانگتے بھی خیرات ہی کی طرح تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا سارا رزق اس گھوڑے کی لنگڑی ٹانگ کے توسل سے نازل ہوتا ہے۔ ایسے پھینچر رشوت لینے والے کے لیے ان کے دل میں نہ کوئی ہمدردی تھی نہ خوف۔

○ کتنوں کے چال چلن کی چوکیداری

احباب نے مشورہ دیا کہ گھوڑے کو رچمند کرافورڈ ہسپتال میں انجکشن سے ٹھکانے لگوا دو۔ لیکن ان کا دل نہیں مانتا تھا۔ بزرگوار تو سنتے ہی روہانے ہو گئے۔ کہنے لگے، آج

لنگڑے گھوڑے کی باری ہے کل اپاج باپ کی ہو گی۔ شریف گھرانوں میں آئی ہوئی دلسن اور جانور تو مر کر ہی نکلتے ہیں۔ وہ خود تین دلسنوں کے جنازے نکال چکے تھے، اس لیے گھوڑے کے بارے میں بھی ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ رحیم بخش بھی گھوڑے کو ہلاک کرانے کے سخت خلاف تھا۔ جیسے ہی ذکر آتا، اپنے تئیں سالہ تجربات بیان کرنے بیٹھ جاتا۔ یہ تو ہم نے بھی سنا تھا کہ تاریخ در حقیقت بڑے لوگوں کی بائیوگرافی ہے۔ لیکن رحیم بخش کوچوان کی ساری آٹو بائیوگرافی دراصل گھوڑوں کی بائیوگرافی تھی۔ اس کی زندگی سے ایک گھوڑا پوری طرح نکل نہیں پاتا تھا کہ دوسرا داخل ہو جاتا۔ کہتا تھا کہ اس کے تین سابق آقاؤں نے ”ویٹ“ سے گھوڑوں کو زہر کے انجکشن لگوائے تھے۔ پہلا آقا تین دن کے اندر اندر چٹ پٹ ہو گیا۔ دوسرے کا چہرہ لقوے سے ایسا ٹیڑھا ہوا کہ دائیں باچھ کان کی لو سے جالی۔ ایک دن غلطی سے آئینے میں خود پر نظر پڑ گئی تو گھٹکی بندھ گئی۔ تیسرے کی بیوی جاکی کے ساتھ بھاگ گئی۔ دیدہٴ عبرت نگاہ سے دیکھا جائے تو ان تینوں میں جو فوراً مر گیا، اسی کا انجام نسبتاً باعزت معلوم ہوتا ہے۔

اسی زمانے میں ایک سائیں خبر لایا کہ لاڑکانہ میں ایک گھوڑی تیلیا کیت بالکل مفت تین سو روپے میں مل رہی ہے۔ بس وڈیرے کے دل سے اتر گئی ہے۔ گنے کی فصل کی آمدنی سے اس نے گنے ہی سے لمبائی ٹاپ کر ایک امریکی کار خرید لی ہے۔ آپ کی صورت پسند آ جائے تو ممکن ہے مفت ہی دے دے۔ اس کی مخالفت پہلے ہم نے اور بعد میں بزرگوار نے کی۔ ہمیں ان دنوں کتے پالنے کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ ہر بات انہی کے حوالے سے کرتے تھے۔ کتوں کے لیے من الجنس ہمارے دل میں دفعۃً اتنا احترام پیدا ہو گیا تھا کہ کتیا کو مادہ کتا کہنے لگے تھے۔ ہم نے بشارت کو سمجھایا کہ خدارا! مادہ گھوڑا نہ خریدو۔ عامل کلاونی میں دنگیر صاحب نے ایک مادہ کتا پال لیا ہے۔ کسی خیر خواہ نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ جس گھر میں کتے ہوں، وہاں فرشتے، بزرگ اور چور نہیں آتے۔ اس ظالم نے یہ نہ بتایا کہ پھر صرف کتے آتے ہیں۔ اب سارے

شر کے بالغ کتے ان کی کوٹھی کا محاصرہ کئے پڑے رہتے ہیں۔ عقیقہ خود غنیم سے ملی ہوئی ہے۔ ایسی تن واما نہیں دیکھی۔ جو بوائے اسکاؤٹ کا ”مانو“ ہے وہی اس کا Prepared Be مطلب یہ کہ ہر حملہ آور سے تعاون کے لیے ہمہ تن تیار رہتی ہے۔ پھانک کھولنا ناممکن ہو گیا ہے۔ خواتین نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ مرد اسٹول رکھ کے پھانک اور کتے پھلانگتے ہیں۔ دھگیر صاحب ان کتوں کو دونوں وقت باقاعدگی سے راتب ڈلواتے ہیں تا کہ آنے جانے والوں کی پنڈلیوں کے بوٹوں سے اپنا پیٹ نہ بھریں۔ ایک دفعہ راتب میں زہر ڈلوا کر بھی دیکھ لیا۔ گلی میں کشتوں کے پٹے لگ گئے۔ اپنے خرچ پر ان کی تدفین کروائی۔ ایک صاحب کا پالتو کتا جو صحبت بد میں پڑ گیا تھا اس رات گھر والوں کی نظر بچا کر تماش بینی کرنے آیا۔ وہ بھی وہیں کھیت رہا۔ ان جید کتوں کے مرنے سے جو خلا پیدا ہوا وہ اسی طرح پر ہوا جس طرح ادب اور سیاست میں پر ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ نئی نسل کے نوجوانوں نے آگے بڑھ کر اس تیزی سے پر کیا کہ خلا بالکل ناکافی ثابت ہوا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ خود کو Indispensable یعنی بے مثل و بے بدل سمجھنے والوں کے مرنے سے جو خلا پیدا ہوتا وہ در حقیقت صرف دو گز زین میں ہوتا ہے جو انہیں کے جسد خاکی سے اسی وقت پر ہو جاتا ہے۔ خیر یہ علیحدہ قصہ ہے۔ کہنا یہ تھا کہ اب دھگیر صاحب سخت پریشان ہیں۔ ”پیڈگ ری“ (خاندانی) مادہ ہے۔ بچ ذات کے کتوں سے شجرہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ میں نے تو دھگیر صاحب سے کہا تھا کہ ان کی توجہات Divert کرنے کے لیے کوئی معمولی ذات کی کتیا رکھ لیجئے تا کہ کم از کم یہ دھڑکا تو نہ رہے۔ راتوں کی نیند تو حرام نہ ہو۔ تاریخ میں آپ پہلے آدمی ہیں جس نے کتوں کے چال چلن کی چوکیداری کا بیڑا اٹھایا ہے۔

○ مونس تنہائی

اس قصے سے ہم نے انہیں عبرت دلائی۔ بزرگوار نے دوسرے پینترے سے گھوڑی خریدنے

کی مخالفت کی۔ وہ اس پر بہت برا فروخت ہوئے کہ بشارت کو ان کے کراماتی وظیفے پر یقین نہیں۔ وہ خاصے گلیر تھے۔ بیٹے کو کھل کر تو گل نہیں دی، بس اتنا کہا کہ اگر تمہیں اپنی نسل چلانے کے لیے پیڈگ ری گھوڑی ہی رکھنی ہے تو شوق سے رکھو، مگر میں ایسے گھر میں ایک منٹ نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ جہاں بلبن گھوڑا جائے گا، وہ بھی جائیں گے۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ بزرگوار اور گھوڑا ایک دوسرے سے اس درجہ مانوس ہو چکے تھے کہ اگر گھر والے مانع نہ ہوتے تو وہ اسے ڈرائنگ روم میں اپنی چارپائی کے پائے سے بندھوا کر سوتے۔ وہ بھی ان کے قریب آ کر خود بخود سر نیچا کر لیتا تا کہ وہ اسے بیٹھے بیٹھے پیار کر سکیں۔ وہ گھنٹوں منہ سے منہ بھڑائے اس سے گھر والوں اور بہوؤں کی شکایتیں اور برائیاں کرتے رہتے۔ بچوں کے لیے وہ زندہ کھلونا تھا۔ بزرگوار کہتے تھے جب سے یہ آیا ہے میرے ہاتھ کا رعشہ کم ہو گیا ہے۔ اور برے خواب آنے بند ہو گئے۔ وہ اب اسے بیٹا کہنے لگے تھے۔ سدا روگی سے اپنے پرانے سب اکتا جاتے ہیں۔ ایک دن وہ چار پانچ گھنٹے درو سے کراہتے رہے۔ کسی نے خبر نہ لی۔ شام کو اختلاج اور مایوسی زیادہ بڑھی تو خانماں سے کہا کہ بلبن بیٹے کو بلاؤ۔ بڑھاپے اور بیماری کے بھیانک سائے میں یہ دکھی گھوڑا ان کا واحد ساتھی تھا۔

○ ایک لقمہ تر کی صورت

گھوڑے کو جوت نہیں سکتے، بچ نہیں سکتے، ہلاک نہیں کروا سکتے، کھڑے کھلا نہیں سکتے۔ پھر کریں تو کیا کریں۔ جب بلیک موڈ آتا تو اندر ہی اندر کھولتے اور اکثر سوچتے کہ سیٹھ، سرمایہ دار، وڈیرے، جاگیردار اور بڑے افسر اپنی شقاوت اور کرپشن کے لیے زمانے بھر میں بدنام ہیں۔ مگر یہ ”بے رحمی والے“ دو نکلے کے آدمی کس سے کم ہیں۔ انہیں اس سے پہلے ایسے رجعتی اور غیر انقلابی خیال کبھی نہیں آئے تھے۔ ان کی سوچ میں

ایک مردم گزیدہ کی کلہبیت اور جھنجلاہٹ در آئی۔ یہ لوگ تو غریب ہیں، مظلوم ہیں مگر یہ کس کو بخشے ہیں؟ سنتری بادشاہ بھی تو غریب ہے۔ وہ ریڑھی والے کو کب بخشا ہے؟ اور غریب ریڑھی والے نے کل شام آنکھ بچا کر ایک سیر سیبوں میں دو داغ دار سیب ملا کر تول دیئے۔ اس کی ترازو صرف ایک چھٹانک کم تولتی ہے، صرف ایک چھٹانک۔ اس لیے کہ ایک من کم تولنے کی گنجائش نہیں۔ اسکول ماسٹر لائق صد رحم و احترام ہے۔ ماسٹر نجم الدین برسوں سے چیتھڑے لٹکائے ظالم سماج کو کوسے پھرتے ہیں۔ انہیں ساڑھے چار سو روپے کھائے جب جا کے بھانجے کے میٹرک کے نمبر بڑھے۔ اور رحیم بخش کوچوان سے زیادہ مسکین کون ہو گا؟ ظلم، ظالم اور مظلوم دونوں کو خراب کرتا ہے۔ ظلم کا پیہ جب اپنا چکر پورا کر لیتا ہے اور مظلوم کی باری آتی ہے تو وہ بھی وہی کچھ کرتا ہے جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اڑوہا سالم لگتا ہے۔ شارک دانتوں سے خونم خون کر کے کھاتی ہے۔ شیر ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اچھی طرح چبا چبا کے کھاتا ہے۔ بلی، چھپکلی، مکڑی اور مچھر سب حسب مقدور و مقدار خون کی چسکی لگاتے ہیں۔ بھائی میرے! بخشا کوئی نہیں۔ وہ یہاں تک پہنچے تھے کہ معاً انہیں اپنے انکم ٹیکس کے ڈبل بھی کھاتے یاد آ گئے اور وہ بے ساختہ مسکرا دیئے۔ بھائی میرے! بخشا کوئی نہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کا ازوقہ ہیں۔ بڑے جتن سے ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔

تب نظر آتی ہے اک لقمہ تر کی صورت